اک جنوں ہے جو باشعور بھی ہے

شعور

مدیر اعلی

ابو محمد قاسمی

انجمن فکر و تحقیق دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ اشاعت نمبر: ۱

اک جنوں ہے جو باشعور بھی ہے

شعور

مدیر اعلیٰ

ابو محمد قاسمی

انجمن فکر و تحقیق دیوبند

مجلس ادارت

ابو محمد قاسمی

محمد حذیفہ صبیح

قاضی عمر بارہ بنکوی

عامر ایاز بجنوری

محمد احمد مظفر نگری

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں۔

منجانب:

انجمن فکر و تحقیق دیوبند

ٹائپنگ و ڈیزائنگ: دلائٹ کمپیوٹر سینٹر دیوبند 9917293126

فہرست عناوین

اداریہ (ابومحمد قاسمی) ---------- ۴

جہانِ فکر وفن

سلسلہ تحقیقات حدیثیہ (۱) (ناصرالدین نعمانی) ---------- ۸
مسئلہ تکفیر اور چند بنیادی باتیں (محمد حذیفہ صبیح) ---------- ۱۴
عبادت لذت کا وسیلہ یا تکمیل کا زینہ (بلال احمد) ---------- ۲۲
حسن ظاہر میں آپ ﷺ اجمل ہیں (حذیفہ ایوبی) ---------- ۲۵
مبادیات تاریخ (۱) (محمد احمد) ---------- ۲۸
نظریۂ ارتقاء عہد بہ عہد (عامر ایاز) ---------- ۳۶
ڈوپامین اور سوشل میڈیا (امجد حسین) ---------- ۴۸

ملی گوشہ

غزہ میں بھوک مری: اسباب اور مستقبل کے امکانات (عبدالعلیم اعظمی) ---------- ۵۳
الشریف: غزہ کا شاہد بھی اور شہید بھی (ریحان احمد اعظمی) ---------- ۵۸

گل گشتِ ادب

مکتوب نگاری (قاضی عمر بارہ بنکوی) ---------- ۶۳
اردو رباعیات (سفیان مظفر) ---------- ۶۵
فکروفن کا عہد: رئیس احمد جعفری ندوی (جواد احمد رستم) ---------- ۷۵
سفر (محمد عمر) ---------- ۸۵
قوم کے غیور نوجوانوں کے نام (رضا خیال دہلوی) ---------- ۸۸
تاریخ جو کھو گئی (عبداللہ ثاقب) ---------- ۹۲
فقہ شریعت کی فہم سلیم (محمد قاصد میواتی) ---------- ۹۶

شعر وسخن

غزہ کی ایک گڑیا کے نام (اسامہ توحید) ---------- ۱۰۲
محبت (ہنر نجمی) ---------- ۱۰۴

اداریہ

ابو محمد قاسمی ❖

لیجئے صاحب ''اداریہ'' پڑھتے جایئے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ دنیا کے بعض خطوں میں مہمان نوازی کا آغاز بے ذائقہ چیزوں سے بھی ہوتا ہے اور اختتام انواع واقسام کی مرغن غذاؤں سے۔ ''شعور'' کا بھی حال یہی ہے اداریہ میں شاید آپ کو کچھ نا ملے لیکن رسالہ مختلف اور متنوع مضامین سے آراستہ ہے، میں نے چاہا کہ پہلے شمارہ کے اداریہ میں صرف اصحاب ''شعور'' اور ''انجمن فکر وتحقیق'' کا تعارف اور مقصد پیش کر دیا جائے تاکہ یہ جاننا آسان ہو جائے کہ ایسے چند نوجوان جن کے چہرے پر پختگی نہیں آئی، ان کے عزائم پختہ، ارادے نیک اور حوصلے بلند ہیں اور وہ اسلامی فکر کی ترجمانی ملت کے ہر طبقہ کے درمیان کرنے کے لئے تیار ہیں اور اپنی جماعت میں ایسے افراد کی شمولیت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں جو کہ قوم وملت کے لئے کسی بھی درجہ میں مفید ہوں۔ آرٹیفشل انٹلیجنس کے زمانہ میں فکر وتحقیق کی بات کرنا مذاق محسوس ہوتا ہے لیکن جو لوگ اس کی خطرناکی محسوس کر رہے ہیں ان پر لازم ہے کہ اپنی آنے والی نسلوں کی فکر کریں، مطالعہ، تحقیق، تجزیہ کی صلاحیت اپنے نوجوانوں میں پیدا کرنے کے لئے ہر لمحہ کوشاں رہیں ''انجمن فکر وتحقیق'' کا مقصد ایسے نوجوانوں کو پلیٹ فارم فراہم کرنا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو اے آئی کے زمانہ میں زنگ آلود نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا دعویٰ قطعی نہیں ہے کہ ''شعور'' کی مجلس ادارت یا ''انجمن فکر وتحقیق'' کی مجلس منتظمہ میں محققین، متبحر علماء، استاذ شعراء اور صاحب قلم افراد موجود ہیں البتہ ہمارا اپنے قارئین سے وعدہ ضرور ہے کہ یہ رسالہ فکری تلبیس سے پاک ہوگا، ہم کسی بھی ایسے نظریہ کے فروغ کا حصہ نہیں ہوں گے جس کی بنیاد اسلام مخالفت پر مبنی ہو۔ اس کے ساتھ ہم مختلف نظریات پر مضامین شائع کریں گے، محاضرات کا نظام بنائیں گے بحث ومباحثہ کا موقع فراہم کریں گے اور نوجوانوں کی راہنمائی کا ہر ممکن سامان فراہم کریں گے۔ انشاء اللہ۔ آپ پوچھیں گے ''شعور'' والے کون ہیں جواب یہ بھی ہو سکتا ہے ''شعور'' والے اگر اس قوم میں موجود ہوتے تو اس قوم کی یہ حالت نہ ہوتی البتہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ

❖ جامعہ عبداللہ ابن عباس للبحوث والدراسات الاسلامیہ دیوبند

رسالہ ''شعور'' والے کون ہیں؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ جیسا کہ آپ نے رسالہ کے سرورق پر مصرعہ پڑھا ''اک جنوں ہے جو باشعور بھی ہے'' رسالہ شعور والوں کا تعارف یہی ہے، ایسے افراد جن میں جنون ہے کسی ناممکن کو ممکن میں بدلنے کا، مخالفت کے درمیان انقلاب کی آواز بلند کرنے کا اور منزل تک رسائی کے لئے ہر ممکن جدوجہد کرنے کا۔

ہماری کوشش ہوگی کہ قلمکاروں، مقررین اور شعراء کو پلیٹ فارم دیں بے شعوروں میں ایسے ''شعور'' والوں کی تلاش کریں جن کے فکر کی گہرائی و گیرائی قوم وملت کی راہنمائی کا کام انجام دے سکے، سوشل میڈیا نے لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے جو ایک خوش آئند قدم ہے لیکن ساتھ ہی ہر رطب ویابس سوشل میڈیا پر موجود ہوتا ہے، انجمن فکر وتحقیق کا مقصد ملک کے مختلف خطوں سے ایسے قلمکاروں کو تلاش کرنا ہے جن کی فکر تلبیس سے پاک ہو، جو ملکی اور عالمی سطح پر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جن کے اندر موضوع پر مکمل تحقیق کے بعد لکھنے کا جذبہ موجود ہو، جو قوم کو فکری اور تحقیقی چیزیں دینا چاہتے ہوں، ایسے دور میں جب ہر ایک سب سے پہلے میں نے لکھا کے مرض میں مبتلا ہو کر غلط اور سہی کی تمیز بھول چکا ہے ایسے میں ان افراد کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے جن کی پہچان فکر وتحقیق ہو۔

ہماری کوشش ہوگی کہ ہندوستان میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو حادثات یا واقعات پیش آرہے ہیں ان کے پیچھے کارفرما عوامل پر گفتگو کریں امت کو اس سلسلے میں دستاویز فراہم کریں تاکہ اس کی روشنی میں راہنمایان قوم اپنا لائحہ عمل طے کرسکیں، کیا وجہ ہے کہ ماب لنچنگ کے سیکڑوں واقعات کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی ٹھوس دستاویز موجود نہیں، سیکڑوں کی تعداد میں ہمارے نوجوان، علماء، اہل قلم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں ان کی زندگی، جدوجہد اور فکر پر مشتمل کوئی دستاویز امت کے سامنے پیش نہیں کی گئی، فسادات ہوتے ہیں، باز آبادکاری پر کام ہوتا ہے لیکن کوئی پوچھے کہ ہمیں آنے والی نسلوں کو ان کے پیچھے موجود عوامل سے باخبر کرنے سے کس نے روکا ہوا ہے، کیوں ہم ہر حادثہ اور واقعہ پر کوئی دستاویز امت کے سامنے پیش نہیں کرتے جو کہ ہم تھوڑی سی محنت کے ساتھ کرسکتے ہیں۔

ہماری کوشش ہوگی کہ متقدمین علماء کی تحریروں کی تنقیح وتسہیل کر کے نئے اسلوب میں پیش کریں تاکہ عوام الناس اس سے مستفید ہوسکیں اور نظریاتی جنگ کے اس دور میں اسلام کی درست ترجمانی کرسکیں۔ بلامبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے اس وقت مختلف نظریہ اور فکر کے حاملین فکری ارتداد کے بیج طبقہ

علماء اور عصری علوم کے ماہرین کے دلوں میں ڈال رہے ہیں اگر متقدمین علما کے علوم کی تسہیل کر کے پیش کر دیا جائے تو اس فکری یلغار کا مقابلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

شعور کا پہلا برقی شمارہ آپ کے موبائل اسکرین پر موجود ہے، یہ چند مخلص، محنتی، نوجوان قلمکاروں کی محنتوں کا نتیجہ ہے، جو تجربہ کی کمی کو محنت سے پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں، یقیناً رسالہ میں بہت کچھ ایسا ہوگا جس پر تنقید کی جا سکتی ہے، ہم ان تمام تنقید نگاروں کی صالح تنقید کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہیں، امید ہے کہ وہ ہماری کمیوں پر ہمیں متوجہ کریں گے تاکہ ہم روز بروز بہتر سے بہتر ہوتے جائیں۔ مجلس ادارت میں موجود نوجوانان کے خلوص نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا اور اسی خلوص اور انتھک محنت پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے اپنے ارادے بڑے اور عزائم بلند رکھیں ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین

جہانِ فکروفن

قسط اوّل

سلسلہ تحقیقات حدیثیہ

ناصرالدین احمد النعمانی المئوی ❖

کسی بھی انسان کی طرف کوئی خلاف واقعہ بات منسوب کرنا انتہائی قبیح عمل ہے۔ حدیث کے باب میں یہ احتیاط انتہائی ضروری ہوجاتی ہے، بنابریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد مبارک میں اپنی طرف نسبت کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے (**من کذب علی متعمدا فلیتبوَّأ مقعده من النار**. (**مقدمہ مسلم، رقم الحدیث ۳**) اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی کی جانب ___ قطع نظر اس کے کہ وہ باتیں کیسی عمدہ اور بامعنی ہیں ___ کتنی ہی خلاف واقعہ باتیں منسوب کردی جائیں، لوگوں کی توجہ اس کی جانب معمولی رہتی ہے اور عموماً اس کی باتوں کو سند بنانے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی عام سی بات بھی خلاف واقعہ منسوب کردی جائے تو سب کی گردنیں اس فرمان کے سامنے جھک جائیں گی اور لوگ اسے شریعت بنا کر دین میں داخل کردیں گے، اسی خدشہ کی وجہ سے حدیث کے باب میں احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہے کہ یہاں شریعت میں کمی بیشی کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے احادیث کی چھان پھٹک میں ہمیشہ بہت عرق ریزی اور توجہ سے کام کیا ہے اور اس سلسلے میں ابتدائی دور سے لے کر اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ پھر بھی عوام بلکہ خواص میں بھی موضوع من گھڑت اور ناقابل اعتبار واستدلال روایات کو دھڑلے سے بیان کیا جاتا ہے، کوئی بھی خطیب اور واعظ حتی کہ بعض علما بلاتحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بھی خودساختہ قول منسوب کرنے میں دریغ نہیں کرتے، جونہایت شنیع امر ہے۔

اسی طرح بہت سی ایسی روایات ہیں جوصحیح اور ثابت ہیں؛ یاضعیف ہیں بھی تو قابل بیان ہیں اور قابل عمل بھی ہیں، لیکن لوگ ان کے متعلق یا تو تذبذب کا شکار ہیں، یا یہ فیصلہ کئے بیٹھے ہیں کہ یہ روایات قابل بیان نہیں۔

❖ فاضل دارالعلوم دیوبند واستاذ ادارہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ مئو

اسی کشمکش کے پیش نظر ضرورت ہے کہ روایات کی استنادی حیثیت لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کی جائے، تاکہ جہاں ایک طرف احادیث کے ذخیرے میں موضوع اور من گھڑت روایات نہ داخل ہوسکیں، وہیں بہت سی احادیث سے حدیث کا لیبل بھی نہ ہٹا دیا جائے۔ اسی ضرورت کے تحت بہ توفیق وفضل خداوندی تحقیق حدیث کا یہ ایک سلسلہ شروع کیا ہے، جو خاطر خواہ مقاصد کی تکمیل کے ساتھ امید ہے بخیر وخوبی اختتام کو پہنچے گا۔ اسی سلسلے کی پہلی حدیث پیش خدمت ہے۔

(ا) أحبوا العرب لثلاث لأني عربي والقرآن عربي وكلام أهل الجنة عربي

اس حدیث کو متعدد محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مثلاً امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ الْحَضْرَمِيُّ، ثنا الْعَلَاءُ بْنُ عَمْرٍو الْحَنَفِيُّ، ثنا يَحْيَى بْنُ بُرَيْدٍ الْأَشْعَرِيُّ، عَنْ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عَطَاءٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضى الله عنهما، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إلخ (المعجم الكبير للطبراني (١٤٤١)، المعجم الأوسط (٥٥٨٣) مجمع البحرين (٢٩٩٠)

امام حاکم روایت کرتے ہیں **حدثني أبو محمد المزني، وأبو سعيد الثقفي في آخرين قالوا: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ سليمان الْحَضْرَمِيُّ، ثنا الْعَلَاءُ بْنُ عَمْرٍو الْحَنَفِيُّ، ثنا يَحْيَى بْنُ يزيد الْأَشْعَرِيُّ، أنبأ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عَطَاءٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضى الله عنهما قال: رَسُول اللهِ ﷺ قَالَ: إلخ(المستدرك على الصحيحين (ج ٥، ص ١١٧، رقم ٧٠٨١)**

حافظ ابوالقاسم تمام بن محمد الرازی نے اسے **حدثنا أبو أحمد زهير بن محمد بن يعقوب الموصلي، ثنا أبو عبد الله الحسين بن عمرو بن أبي الاحوص الكوفي، ثنا العلاء بن عمرو الحنفي، ثنا يحيى بن بريد الاشعري، عن ابن جريج الخ** کی سند سے روایت کیا ہے **(الفوائد لأبي القاسم تمام (ج ١، ص ٦١، رقم ١٣٤)**

اسی سند سے حافظ ابن عسا کرنے بھی زہیر بن محمد الموصلی کے ترجمہ میں روایت کیا ہے: **أخبرنا أبو محمد عبد الكريم بن حمزة، نا عبد العزيز، نا تمام بن محمد الرازي، حدثني أبو الخير زهير بن محمد بن يعقوب الموصلي إلخ** (تاریخ مدینۃ دمشق (ج ١٩، ص ١١٥)

نیز حافظ ابن عسا کرنے اس روایت کو اپنے استاد سبیع بن المسلم أبوالوحش المقری المعروف بابن قیراط کے ترجمہ میں بھی روایت کیا ہے (ج ٢٠، ص ١٤٠)

حافظ ابونعیم اصبہانی نے اسے حدثنا عیسی بن حامد بن بشر الدخجی، حدثنا الحسن بن أبی الاحوص، حدثنا العلاء بن عمرو الحنفی، حدثنا یحیی بن یزید الاشعری عن ابن جریج إلخ کی سند سے روایت کیا ہے۔(صفۃ الجنۃ للحافظ اُبی نعیم الاصبہانی (ج۲،ص۱۱۲، رقم ۲۶۸)

ان تمام محدثین نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور سب کی سندوں کا مدار العلاء بن عمرو الحنفی عن یحیی بن یزید الاشعری عن عطاء پر ہے،(بعض لوگوں نے یحیٰی بن یزید کی جگہ برید الاشعری نقل کیا ہے) اور العلاء الحنفی سخت مجروح راوی ہے،اس راوی کے تعلق سے محدثین کے اقوال جرح حسب ذیل ہیں:

العلاء بن عمرو الحنفی:

ابن حبان قال: لا یجوز الاحتجاج به بحال .لسان المیزان (ج۵،ص۴۶۶)
وقال النَّسائی: ضعیف نقله عنه أبو العرب فی تألیفه.(لسان المیزان (ج۵،ص۴۶۶)
قال الذهبی: متروک.لسان المیزان (ج۵،ص۱۲۸)
امام ابوحاتم نے اس کی مذکورہ حدیث کو کذب کہا، اور عقیلی نے موضوع کہا۔(لسان المیزان ج(۵،ص۴۶۶)
علامہ ذہبی نے موضوع کہا:لسان المیزان (ج۵،ص۱۲۸)

وقال عبد الله بن عمر بن أبان: سمعت أنا والعلاء بن عَمْرو من رجل حدیثا عن سعید بن مسلمة فسألوا العلاء عنه بحضرتی فقال: حدثنا سعید بن مسلمة. لسان المیزان (ج ۵، ص ۴۶۶)

محدثین کے اتنے سخت اقوال کے بعد اس راوی سے استدلال کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، لیکن جس قسم کا برتاؤ اس راوی کے ساتھ روا رکھا گیا یہ اتنا بھی ضعیف نہیں، چنانچہ محدثین سے اس کی توثیق بھی کی ہے، ملاحظہ ہو:

نقل الحاکم فی تاریخ نیسابور عن صالح جزرة أنه سئل عنه فقال: لا بأس به. لسان المیزان (ج۵،ص۴۶۶)

وقال أبو حاتم: کتبت عنه وما رأیت إلا خیرا.الجرح والتعدیل (ج۶،ص۳۵۹)
ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا اور کہا:ربما خالف (الثقات ج۸ص۵۰۴)

اسی طرح امام حاکم نے اس کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد کہا ہے اور علامہ ذہبی نے اس پر سکوت کرتے ہوئے حدیث کو صحیح کہا ہے، البتہ العلاء کے بجائے ایک دوسرے راوی پر امام احمد بن حنبل کی ایک جرح نقل کی ہے۔ **المستدرک علی الصحیحین مع تلخیص الذهبی (ج ۴، ص ۱۲۹، فضيلة إطعام الطعام)**

اسی طرح امام حاکم کے اس صحیح الاسناد کہنے پر علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی سکوت کیا ہے۔ **(اتحاف المهرة فی الفوائد المبتكرة (ج ۱۶، ص ۲۶۹، رقم ۲۰۷۵۹)**

آیئے اب دیکھتے ہیں ان اقوال جرح کی کیا حیثیت ہے جو اس راوی کے سلسلے میں محدثین سے منقول ہیں، چنانچہ ذہبی وغیرہ نے جو اقوال نقل کیے ہیں، اگر چہ وہ جرح مفسر ہیں، لیکن ان اقوال کی بنیاد کیا ہے کسی نے بیان نہیں کی، اور بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں، یقیناً یہ سب اقوال اس کے حق میں قبول کیے جاویں گے۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں ایک واقعہ نقل کیا ہے:

"وقال عبد الله بن عمر بن أبان: سمعت أنا والعلاء بن عَمْرو من رجل حديثا عن سعيد بن مسلمة فسألوا العلاء عنه بحضرتي فقال: حدثنا سعيد بن مسلمة".

اس واقعہ سے معلوم ہوتا کہ عبداللہ بن عمرو بن ابان نے جب یہ دیکھا کہ علاء بن عمرو براہ رجل عن سعید بن مسلمہ کے بجائے براہ راست مسلمہ سے روایت کر رہے ہیں اور وہ بھی صیغہ تحدیث سے، لہٰذا علاء بن عمرو نے جھوٹ بولا۔

حالانکہ دیکھا جائے تو یہ علاء بن عمرو کے ساتھ زیادتی ہے، اس لیے کہ ضروری نہیں کہ علاء بن عمرو نے وہ حدیث اسی رجل مجہول کے واسطے سے سنی ہو اور کبھی براہ راست سعید بن مسلمہ سے نہ سنی ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ عبداللہ بن عمر بن ابان کی موجودگی میں تو رجل مجہول عن سعید بن مسلمہ سماع کیا ہو اور کبھی براہ راست بھی سماع حاصل ہو گیا ہو، ایسے میں یقینی طور پر یہ فیصلہ کر دینا کہ اس نے جھوٹ بولا یہ بڑی جرأت کی بات ہے۔

اس لئے اس کے بارے میں درست موقف یہی ہو سکتا ہے جب محدثین کی توثیق بھی پائی گئی تو یہ راوی بالکل ساقط الاعتبار نہیں، خصوصا جب کہ اس کا متابع اور شاہد بھی پایا جاتا ہو۔ چنانچہ محمد بن الفضل نے بھی اس حدیث کو ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس روایت کیا ہے، اس سند کے ساتھ بھی اس حدیث کو امام حاکم نے نقل کیا ہے:

"حدثنا أبو عبد الله محمد بن أحمد بن بطة الاصبهانی، ثنا عبد الله بن محمد بن زكريا، ثنا اسماعيل بن عمرو، حدثنا محمد بن الفضل، عن ابن جريج عن عطاء عن ابن عباس رضی الله عنهما إلخ" (المستدرک علی الصحیحین ج (۵،ص ۱۱۷، رقم ۷۰۸۲)

اسی طرح حافظ ابونعیم الاصبہانی نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

"حدثنا أبو محمد بن حيان، حدثنا عبد الله بن محمد بن زكريا، ثنا إسماعيل بن عمرو البجلی، ثنا محمد بن الفضل إلخ" صفۃ الجنۃ للحافظ أبی نعیم الاصبہانی (ج ۲،ص ۱۱۳، رقم ۲۶۹)

لیکن حق بات یہی ہے کہ محمد بن الفضل کو کذاب، متروک کہا گیا ہے، کسی بھی محدث سے اس کی توثیق نہیں ملی، اس لئے یہ راوی متابعت کے لائق بھی نہیں ہے جس سے حدیث حسن درجہ کو پہنچ جائے

البتہ اس حدیث کا ایک شاہد ہے، چنانچہ حافظ ابونعیم اصبہانی روایت کرتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن محمد بن جعفر، ثنا عبد الله محمد بن عبد الكريم، حدثنا إبراهيم بن الهيثم، ثنا أبی الهيثم بن مهلب، حدثنا العباس بن الفضل، عن سليمان بن ارقم، عن الزهری، عن سعيد بن المسيب، عن أبی هريرة رضی الله أن رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: و كلام أهل الجنة العربية" (صفة الجنة للحافظ أبی نعيم الاصبهانی) (ج ۲، ص ۱۱۳، رقم ۲۶۹)

اس روایت کی سند میں عباس بن فضل متروک ہے اور سلیمان بن ارقم بھی مجروح راوی ہے، اس لئے اس شاہد سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

اس روایت کو تینوں جز کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے:

"حدثنا مسعدة بن سعد، نا ابراهيم بن المنذر، نا عبد العزيز بن عمران ثنا شبل بن العلاء بن عبد الرحمن عن أبيه عن جده عن أبی هريرة قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: أنا عربی، والقرآن، عربی لسان أهل الجنة عربی"

اس کی سند میں عبدالعزیز بن عمران پر سخت جرحیں ہیں لیکن متہم بالکذب والوضع نہیں ہے، اور شبل بن العلاء بھی متکلم فیہ راوی ہے بعض نے مجہول کہا ہے۔

خلاصہ کلام کہ یہ روایت بھی ضعیف ہے، البتہ اس سے اتنا فائدہ ہوگا کہ مذکورہ روایت ضعف شدید سے ضعف یسیر تک ترقی کر جائے گی۔

اور روایت کا مضمون دیکھیں تو پوری روایت کے چار اجزاء بنتے ہیں:

(۱) حب عرب (۲) حضور کا عربی ہونا (۳) قرآن کا عربی ہونا (۴) اہل جنت کے کلام کا عربی ہونا۔

شروع کے تین اجزاء میں تو اختلاف کی گنجائش نہیں، چوتھا جزو بھی قیاس کے مطابق درست ہے، اس لئے حدیث کا مضمون تو صحیح کہا جا سکتا ہے، البتہ روایت ضعیف ہے، بس متابع اور شاہد کی بنیاد پر یہ روایت ضعف شدید سے ضعف یسیر تک ترقی کر جائے گی اور اس کے مضمون کو بیان کرنا درست ہو جائے گا فضائل کے باب میں۔ واللہ اعلم

مسئلہ تکفیر اور چند بنیادی باتیں

محمد حذیفہ صبیح ❖

کسی مسلمان پر اس وقت تک کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، جب تک معتبر اور یقینی دلائل سے اس کا عقیدۂ کفر واضح نہ ہوجائے۔ شریعت اسلامیہ نے اس سلسلہ میں نہایت حزم واحتیاط سے کام لینے اور افراط وتفریط سے بچنے کی تلقین کی، مختلف نصوص (قرآن وحدیث) میں تکفیر کے متعلق ضابطے مقرر فرمائے اور اصول تکفیر کے انضباط میں فقہاء و متکلمین کی رہنمائی کی۔ قول مؤمن کو حتی الوسع صحیح قرار دینے کا حکم دیا، حتی کہ کسی شخص کے کلام میں اگر ننانوے وجوہ کفر کی اور ایک وجہ اسلام کی ہو تو اس کے کلام کو اسلام پر محمول کرنے کی ہدایت کی۔ مسئلہ تکفیر ہی کی چند بنیادی اصطلاحات ونکات درج ذیل ہیں۔

کفر وایمان:

اصول تکفیر کے ذکر سے قبل کفر وایمان کی تعریف بیان کر دینا مناسب ہے۔

ایمان: لغۃً ''مامون کر دینے'' کے معنی میں آتا ہے۔ جبکہ متعدد متکلمین علماء ایمان کو تصدیق کے معنی میں مشترک کہتے ہیں، یہ اشتراکِ معنوی لغت اور نص دونوں میں مطابقت کیلیے اہمیت رکھتا ہے۔

اصطلاحاً: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی گئی شریعت کی تمام چیزوں کی تصدیق کو ایمان کہا جاتا ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے اپنے رسائل میں ایمان کی اسی تعریف کو بنیاد بنایا ہے۔ متکلمین کے نزدیک چونکہ محض قطعیات پر کفر وایمان کا حکم لگتا ہے، اسی لئے انہوں نے ایمان کی تعریف میں "ضرورۃً" کی قید کا اضافہ کیا، جس سے غیر قطعی، قطعی غیر ضروری اور نظری واکتسابی اشیاء براہ راست معیارِ کفر وایمان بننے سے نکل گئیں۔

❖ متعلم تکمیل افتاء دارالعلوم دیوبند

اصول ایمان:

ایمان کا تعلق اگر چہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام باتوں سے ہے، البتہ چند اصول وعقائد وہ ہیں جن پر ایمان لائے بغیر دیگر امور کو تسلیم کرنا لا حاصل اور بے معنی ہے۔ وہ درج ذیل ہیں (۱) **ایمان باللہ**: اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد اور شرک سے اس کو بری سمجھنا۔ (۲) **ایمان بالملائکہ**: اللہ کے۔ فرشتوں کو حق جاننا۔ (۳) **ایمان بالکتب**: اللہ کی جانب سے نازل کردہ تمام رسائل وصحف اور کتابوں کو حق اور سچ گردانا۔ (۴) **ایمان بالرسل**: اللہ نے فرستادہ تمام انبیاء ورسل کو سچا ماننا اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا اور آخری نبی ماننا۔ (۵) **ایمان بالیوم الاخر**: روز قیامت پر ایمان اور بعث بعد الموت پر یقین رکھنا۔ (۶) **ایمان بالقدر**: دنیا میں پیش آمدہ تمام حالات وواقعات کو اللہ کی جانب سے مقدر ماننا۔ یہ بنیادی اصول گویا مدار و بنیاد ایمان ہیں۔

شرائط ولوازم ایمان:

علمائے امت نے ایمان کی علامات کے طور پر ایمان کے کچھ لوازم وشرائط بھی ذکر فرمائے ہیں، جو کفر وایمان کا فیصلہ کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ انہیں ہم اجمالاً تحریر کرتے ہیں۔

(۱) **اقرار باللسان**: زبان سے اقرار اگر چہ ایمان کا جز نہیں البتہ دنیاوی احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے اور مطالبے کے وقت واجب بھی۔ (۲) **رضا وتسلیم**: تمام احکامات خداوندی پر دلی رضامندی اوران کو تسلیم کرنا۔ (۳) **تعظیم واحترام**: تمام امور شرعیہ کو بنظر احترام وتعظیم دیکھنا۔ (۴) **اطاعت وانقیاد**: تمام اوامر ونواہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور ہر حکم کو بجالانا۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے "الفقہ الاکبر" میں اس شرط کو وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اللہ کے تمام احکامات کو بجالانا اسلام ہے، اسلام وایمان لغۃً متغایر ہیں حقیقۃً نہیں۔ ان کی مثال کسی سکے کے دو پہلو اور کسی باطن کے ظاہر کی سی ہے۔ (شرح الفقہ الاکبر، ص ۲۶۶) (۵) **دیگر ادیان و مذاہب سے بیزاری اور براءت**: اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہے۔ "ان الدین عند اللہ الاسلام"۔ اس لیے تمام ادیان سے براءت کر کے محض اسی کو سچا ماننا ضروری ہے۔ دیگر مذاہب کو بھی حق گردانا حقیقت میں خداوندی کا انکار ہے۔

واضح رہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ایمان محض تصدیق قلب کا نام ہے۔ مذکورہ اشیاء محض شرائط وعلامات ہیں جو ایمان کا جز نہیں ہے۔

اس کے بالمقابل کفر لغۃً ''ڈھانپنے'' کے معنی میں آتا ہے۔

اصطلاحاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی گئی شریعت کی باتوں میں سے کسی ایک کے انکار کا نام کفر ہے۔ کفر کی ایک دوسری تعریف "عدم الایمان بما جاء به النبی " سے بھی کی گئی ہے۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ دوسری تعریف میں تصدیق وتکذیب سے قطعاً تعارض نہ کرنے والے کا حکم واضح ہوگیا ہے۔ بعد کے متکلمین علماء کے یہاں کفر کی یہی تعریف رائج ہوئی اور راجح بھی۔

تصدیق نہ کرنے کے اعتبار سے کفر کی کئی قسمیں ہیں جن میں: ارتداد، الحاد، زندقہ، شرک، نفاق قابل ذکر ہیں۔

محل انکار کے اعتبار سے بھی کفر کی متعدد اقسام ہیں جن میں: کفر انکار، کفر عناد اور کفر جحود بطور خاص ذکر کی جاتی ہیں۔

تکفیر کا ایک بنیادی ضابطہ:

جس طرح کفر کے لیے کسی بھی قطعی حکم کا انکار کافی ہے، اسی طرح تکفیر کا تعلق یقینی اور بے غبار امور سے ہے۔ کسی کی تکفیر کے لیے محض ظن وتخمین اور گمان سے فیصلہ کرنا مومنین کا شیوہ نہیں۔ حدیث مبارک میں ایسے شخص کے لیے- جو بلاتحقیق کسی مسلمان کو کافر کہے- کافر ہوجانے کی وعید وارد ہوئی ہے:عن عبدالله بن عمر: أَيُّما رَجُلٍ قالَ لأخِيهِ: يا كافِرُ، فقَدْ باءَ بها أحَدُهُما (صحیح البخاری .الرقم:۶۱۰۴)اسی بنیاد پر فقہاو متکلمین نے تکفیر کی بعض اہم شرائط ذکر کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

شرائطِ تکفیر:

تکفیر کی شرائط کا تعلق تین امور سے ہے: (۱) تکفیر کرنے والے سے (۲) کفر کا ارتکاب کرنے والے سے (۳) شئے مکفر سے۔

(۱) تکفیر کرنے والے کے لیے اصول افتا اور زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت کے ساتھ اس کا عادل، ثقہ اور متیقظ وبیدار مغز ہونا ضروری ہے۔

(۲) جو شخص کلمۂ کفر کا ارتکاب کررہا ہے، اس کی تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ: عاقل و متمیز اور باشعور ہو، کلمۂ کفر پر راضی ہو۔ چنانچہ غلطی سے کلمۂ کفر کہہ دینا براہ راست اور فوری تکفیر کا باعث نہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ موانع تکفیر نہ پائے جائیں۔ (موانع تکفیر کا ذکر آئندہ آرہا ہے۔)

(۱) شئ مکفّر کے حوالے سے بھی چند شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں : (۲) موجبِ کفر ہو: کسی قول وعمل یا اعتقاد کے موجب کفر ہونے کے لیے بنیادی طور پر یہ تعیین ضروری ہے کہ وہ ایمان کی شرائط کے منافی ہے یا نہیں۔ جو قول وعمل یا اعتقاد ایمان کی شرائط کے منافی ہے اس کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں مذکور ہے۔ البتہ جو اشیاء لوازم ایمان کے منافی نہ ہوں ان کے موجب کفر ہونے کے لیے تین اصطلاحات میں سے کسی ایک کا وجود ضروری ہے۔

(۱) **استخفاف**: کسی بھی حکم شرعی کو حقیر سمجھنا۔ وہ نواہی جن پر وعید نازل فرمائی گئی ان کو بے وزن سمجھنا بھی استخفاف ہے۔

(۲) **استہزاء**: امور شرعیہ کا مذاق اڑانا تمسخر کرنا اوران کی تحقیر کرنا

(۳) **استحلال**: حرام شرعی کو حلال سمجھنا۔

اس کی بنیادی شرائط یہ ہیں(: ۱) حرام شرعی کو حلال سمجھنے والا حرام شرعی کا مکمل علم رکھتا ہو۔ (۲) حرام شرعی کو تاویل کی بنیاد پر حلال نہ سمجھتا ہو۔ (۳) وہ معصیت جس کو حلال سمجھتا ہو، اس کا ثبوت قطعی ہو۔ وہ معصیت حرام ہوتو اس کی حرمت لعینہ ہو۔

شئ مکفر کے لحاظ سے دوسری شرط یہ ہے کہ کفریہ عمل صادر ہونے کا شرعی ثبوت موجود ہو، دلالت صریح ہو اور کفر یقینی ہو۔

موانعِ تکفیر:

مرتکب کفر کے متعلق ذکر کردہ شرائط میں موانع تکفیر اہمیت کے حامل ہیں۔ موانع تکفیر تین ہیں اور ہر ایک مستقل طور پر تکفیر میں مانع بنتا ہے۔

(۱) **جہل**: جہل اور لاعلمی ایسے احکام میں مانع بنتا ہے جو متعارف ومشہور اور بدیہی نہ ہو ں۔ ضروریات دین میں جہل معتبر نہیں۔

(۲) **اکراہ**: مسئلہ تکفیر میں بحیثیت مانع وہی اکراہ معتبر ہے جو جان جانے یا عضو تلف ہو جانے کے اندیشے پر مشتمل ہوا۔ اکراہ کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مکرہ کے لیے عزیمت ش ء مکرہ کا انکار ہی ہے۔ موجب کفر پر عمل کرنا محض اس شرط کے ساتھ رخصت ہے کہ ایمان پر انشراح صدر ہو۔ عزیمت کے بجائے اگر رخصت پر عمل کرنا ناگزیر ہوتو مکرہ کو چاہیے کہ حتی الامکان موجب کفر کے براہ راست اور صریح اظہار وارتکاب سے بچے اور توریہ سے کام چلائے۔ اس مقام پر علماء کی

تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ توریہ کی صورت ذہن میں آنے کے بعد بھی کسی نے قصداً موجب کفر پر عمل کیا تو کفر شمار ہوگا۔

فقہاے شوافع نے اس سلسلے میں ایک مناسب توجیہ فرمائی ہے کہ اگر مکرہ سے آئندہ کوئی دینی خدمت متصور ہو تو اس کا رخصت پر عمل مناسب ہے؛ ورنہ عامی عزیمت پر ہی عمل کرے گا۔

(یعنی اکراہ کی صورت میں دباؤ میں اکر کلمہ کفر زبان پر نہیں لائے گا خواہ جان کا خطرہ ہو)

(۳) موانع تکفیر میں سب سے اہم معنی تاویل ہے۔

تاویل لغۃً: لوٹانے اور پھیر دینے کے معنی میں آتا ہے۔

اصطلاح میں: نصوص کو ظاہری معنی سے پھیر کر دوسرے معنی پر محمول کرنا تاویل ہے۔

تاویل کے جواز کے لیے شرط یہ ہے کہ مؤول معنی نصوص سے متصادم نہ ہوں اور لفظ میں اس معنی کا احتمال موجود ہو۔ یہ تاویلِ جائز ہے جس کے لیے چند شرائط کافی اہم ہیں(:۱) پہلے معنی مراد لینا بالکل متعذر ہو۔ (۲) اس تاویل کی کوئی دلیل شرعی موجود ہو۔ (۳) تاویل کردہ معنی، متوارث و متواتر معنی کے خلاف نہ ہوں۔ (یہی وجہ ہے کہ ضروریات دین میں تاویل جائز نہیں۔) (۴) تاویل کرنے والا صحیح تاویل کی اہلیت رکھتا ہو۔

تاویل جب تک صحیح اور درست قواعد پر استوار ہو، وہ تصدیق کے حکم میں ہے۔امام غزالی علیہ الرحمہ نے تاویل کے پانچ درجے متعین فرمائے ہیں جن میں اعلی درجہ تمام ادنی درجات کو شامل ہے۔ اعلی کی جانب سے ادنی پر کسی برہان اور دلیل شرعی کے بغیر عدول جائز نہیں۔تفصیل " فیصل التفرقه بين الاسلام و الزندقه" میں ملاحظہ ہو۔

شرائط تکفیر کے بعد تکفیر کے لحاظ سے امور عقائد کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

(۱) **ضروریات دین:** وہ اشیاء جو قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ (ثبوت میں متواتر و قطعی اور اپنے مفہوم پر دلالت کے لحاظ سے واضح) ہونے کے ساتھ عوام وخواص میں دین ہونے کے اعتبار سے مشہور ہوں۔ضروریات دین کی تحدید وتعریف مشکل ہونے کی بنا پر بعض حضرات نے محض شہرت کو کافی سمجھا ہے قطعی ہونے کو نہیں۔

بہر حال ان اشیا کا انکار بلا تفصیل کفر ہے۔ بالاتفاق ان کے منکرین کی تکفیر کی جائے گی۔

(۲) دوسرے امور جو اس قدر متعارف نہ ہوں یا متعارف ہوں مگر نظر اور ردوکد کے بعد حاصل

ہوں ان کی تکفیر سے قبل مرتکب کو اس کے کفر پر مطلع کیا جائے گا۔ اگر وہ اس معنی پر مصر رہے یا انکار میں غلو کرے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ اسی طرح کسی شخص کے قول سے اگر کفر لازم آتا ہو، مگر وہ کفر کا التزام نہ کرے، نہ ہی اس کا ارادہ کفر کا ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اس کو لزوم کفر پر مطلع کر کے تصدیق کرائی جائے گی، اور سابقہ اصول کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ متکلمین علماء کے نزدیک ہر قطعی شئی کا انکار کفر ہے، تکفیر کے لیے البتہ صراحت اور یقینی دلائل ضروری ہیں۔

ضروریات دین کے حوالے سے درج ذیل چند نکات بھی خاطر نشان رہنے چاہییں:

- ضروریات دین میں قطعیت کے لحاظ سے محض تواتر بالسند ہی کی قید نہیں، بلکہ تواتر کی دوسری اقسام: تواتر طبقہ و تواتر عمل و توارث بھی شامل ہیں۔
- اس بنا پر ضروریات دین میں موجود حکم کا فرض ہونا ضروری نہیں، واجب و سنت و مستحب ہونا بھی ممکن ہے۔ یہ حکم متکلمین کے مطابق ہے، فقہا کے یہاں قطعی صرف فرض ہوا کرتا ہے۔
- ضروریات دین مختلف علاقوں اور خطوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوسکتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر علاقے میں ہر شے دین ہونے کے لحاظ سے معروف بھی ہو؛ متعدد علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔
- ضروریات دین کی قیدِ شہرت میں عوام سے مراد وہ عوام ہیں جو دیندار ہوں اور مربوط بالعلماء ہوں۔ ہر عامی اور جاہل شخص کا ان اشیاء سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔
- ضروریات دین میں، شرائط تکفیر سے محض جہل اور تاویل کا اعتبار نہیں؛ اس کا سبب ان کا قطعی اور ایک متوارث مفہوم پر مشتمل ہونا ہے۔ اس متوارث مفہوم میں تاویل گویا مجمع علیہ شئی میں تحریف ہے۔

اہل قبلہ کی تکفیر:

اس بحث میں ایک اہم مسئلہ اہل قبلہ اور ان کی تکفیر کا ہے۔

اہل قبلہ سے لغۃً وہ افراد مراد ہیں جو نماز پڑھیں کعبہ کو قبلہ مانیں اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھائیں۔

اصطلاحی اعتبار سے اہل قبلہ ان افراد کو کہا جائے گا جو ضروریات دین کے منکر نہ ہوں اور سابقہ علامات بھی ان میں پائی جائیں۔

اہل قبلہ کی اصطلاح کی بنیاد دو احادیث پر ہے۔ دونوں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی

ہیں۔(۱)عن أنس بن مالک قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ثلاث من أصل الإيمان الكف عمن قال لا إله إلا الله ولا نكفره بذنب ولا نخرجه من الإسلام بعمل (ابو داؤد ۲۵۳۲ باب فی الغزو مع أئمة الجور) .

(۲) مَن صلّی صلاتَنا، واستقبلَ قبلتَنا، وأكلَ ذبيحتَنا، فذلک المسلمُ الذی له ذمةُ اللهِ وذمةُ رسولِه، فلا تُخفِروا اللهَ فی ذمتِهِ (رواه البخاری برقم: (۳۹۱))

حدیث اول میں تکفیر کے لیے "بذنب" کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ضرورت دین کا معتقد ہے تو محض گناہ کی بنا پر اس کی تکفیر ممنوع ہے۔ اور ضروریات دین کا منکر مذکورہ بالا علامات کے ساتھ بھی کافر شمار ہوگا۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ بعض ائمہ کرام سے منقول جملہ: لا نکفر اهل القبلة "میں بھی" بذنب" کی قید ملحوظ ہے جیسا کہ امام اعظم علیہ الرحمہ سے منتقی میں منقول ہے۔ (اکفار الملحدین) چنانچہ اس قول کو بنیاد بنا کر آج کے متجددین کا اہل قبلہ کو کافر قرار نہ دینے کا واویلا کرنا درست نہیں۔

یہاں ایک بحث اسباب کفر کی رہ جاتی ہے، جس کی مختصر وضاحت یہ ہے:

اسباب کفر تین ہیں: (۱) اعتقاد (۲) قول (۳) عمل

(۱) **اعتقاد:** وہ امور جو قطعی ہوں اور ان کا اعتقاد رکھنے کا شریعت نے حکم دیا ہو یا وہ امور قطعی تو ہوں مگر شریعت نے ان کا اعتقاد نہ رکھنے کا حکم دیا ہو۔ بالترتیب خلاف حکم شریعت ان کا اعتقاد رکھنا یا نہ رکھنا کفر ہے۔ اس کے برخلاف دیگر وہ اعتقادات جو قطعی نہ ہوں، ان کے اعتقاد پر تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(۲) **قول:** وہ قوال جن پر شریعت نے ایمان کا مدار رکھا اور ان کا انکار براہ راست کفر ہے، وہ شہادتین ہیں۔ بقیہ اقوال کا انکار کرنا کفر نہیں۔

(۳) **اعمال:** اعمال میں بعض وہ ہیں جن کا نہ کرنا بالاتفاق کفر نہیں ہے۔ بعض وہ ہیں جن کا کرنا کفر ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں: توحید و رسالت کی گواہی۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج۔

صحیح قول یہ ہے کہ اعتقاد رکھتے ہوئے ان کا نہ کرنا بھی کفر نہیں الا یہ کہ ان کا مطالبہ کیا جائے۔

تکفیر کے متعلق یہ چند بنیادی باتیں مفید ثابت ہوں گی اور تفصیلی مطالعہ میں مددگار بھی۔ خداوند قدوس ہم کو کفر کے ارتکاب سے محفوظ فرمائے۔

مآخذ:

فیصل التفرقه بین الاسلام والزندقه. از امام غزالی.
شرح العقیدة الطحاویة. ازعبدالسلام شنار
اکفار الملحدین. ازعلامہ انورشاہ کشمیری۔
تحقیق الکفر والایمان. ازمولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
مسلمان کون اور کافر کون۔ ازمولانا ادریس کاندھلوی
تکفیر کے اصول از حضرت مفتی شفیع عثمانی
اصول تکفیر ازمفتی عبیدالرحمٰن مردانی

عبادت لذت کا وسیلہ یا تکمیل کا زینہ؟

بلال احمد ❖

ربِّ کائنات نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُونِ (سورۃ الذاریات) اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری عبادات کا فائدہ دراصل ہمیں ہی پہنچتا ہے۔ ہماری بندگی سے خدا کی خدائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، نہ ہماری غفلت و نافرمانی سے اس کی سلطنت کو کوئی نقصان لاحق ہوتا ہے۔ وہ ربّ، جو ہر شیء سے بے نیاز ہے، ہماری سجدہ ریزیوں کا محتاج نہیں۔

یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان جو بھی عمل کرتا ہے، وہ رائیگاں نہیں جاتا۔ ہر عمل، خواہ وہ نیکی ہو یا بدی، اپنے دامن میں ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ اچھے اعمال انسان کی روح کو جِلا بخشتے ہیں، دل کو سکون عطا کرتے ہیں، اور آخرت میں ابدی راحت کا سامان بنتے ہیں۔ اور برے اعمال، چاہے کتنے ہی حسین پردوں میں لپٹے ہوں، انسان کو روحانی پستی کی طرف لے جاتے ہیں اور انجام کار عذابِ جہنم کا باعث بنتے ہیں۔

لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ ہم عبادت کیوں کرتے ہیں؟ کیا محض جنت کی لذّات، حور و قصور، اور ابدی راحت ہمارا مطمحِ نظر ہے؟ کیا یہ صرف جنت پانے کے لیے ہے؟ اور اگر عبادت نہ کی، تو دوزخ کی دہکتی آگ ہمارا مقدر؟ دراصل اس سوال کی گہرائی میں جائیں تو یہ ہمیں اس بنیادی نکتہ کی طرف لے جاتا ہے کہ تکالیفِ شرعیہ کا مکلّف بنائے جانے کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا محض انعام و سزا؟ یا کچھ اس سے بلند تر؟

اسلامی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ انسان کو عبادات و تکالیفِ شرعیہ کا مکلّف اس لیے بنایا گیا تاکہ وہ تدریجی طور پر روحانی ارتقاء کے منازل طے کرے، اپنی فطری استعدادات کو پروان

❖ استاد عربی جامعہ حسینیہ مدنی نگر کشن گنج بہار

چڑھائے، اور روحانی تکمیل کے اوجِ ثریا تک رسائی حاصل کرے۔ عبادت تو ایک مشق ہے، ایک تربیت ہے جو انسان کو خود شناسی سے خدا شناسی کی طرف لے جاتی ہے۔

افسوس کہ آج سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز پر اسلام اور مسلمانوں کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے۔ کچھ ناواقف یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان محض جنت کی لذّات کے حصول کے لیے عبادت کرتے ہیں؛ ان کی سجدہ ریزی کا مقصد خالق و مالک کی رضا نہیں ہے، بلکہ محض حوروں کا خواب ہے۔ یہ ایک سنگین غلط فہمی ہے، جسے دور کرنا نہایت ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی روح عبادت کو محض ثواب و عذاب کے ترازو میں نہیں تولتی، بلکہ اسے انسان کی باطنی تطہیر، اخلاقی تربیت، اور روحانی بلندی کا زینہ قرار دیتی ہے۔ جنت کا حصول عبادت کا انعام ضرور ہے، مگر عبادت کی اصل غرض و غایت ''رضائے الٰہی'' ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے، اس کے لیے جنت نہ کوئی لالچ ہے اور نہ دوزخ کا خوف کوئی رکاوٹ، بلکہ صرف محبوبِ حقیقی کی رضا ہی اس کی بندگی کا مرکز و محور بن جاتی ہے۔

مذہب کا اصل مقصد صرف جنت کے لذائذ اور نعمتوں کا حصول نہیں ہے جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اصل مقصد اللہ کی معرفت (پہچان) اور اس کی رضا (خوشنودی) کا حصول ہے۔ اور جنت کی سب سے بڑی نعمت دو چیزیں ہیں: اللہ کی رضا اور اس کا دیدار۔ یہی ان تمام شرعی عبادات، مجاہدات اور احکام کی اصل غایت ہے۔ الغرض جنت نعم البدل ہے، نہ کہ مقصدِ اعلیٰ؛ لہٰذا جنت کی نعمتیں انسان کی آخری طلب یا معراج نہیں ہے، بلکہ وہ رب العالمین کی رضا کا نتیجہ اور انعام ہیں۔

ان تمام شرعی احکام کا سب سے اعلیٰ مقصد معرفتِ الٰہی و رضائے الٰہی یعنی اللہ کو پہچاننا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ یہی بندگی کا جوہر ہے۔ تمام عبادات، طاعات، اور مجاہدات کا محور صرف اللہ کی رضا ہونی چاہیے، نہ کہ صرف جنت کی طلب۔

ارشاد ربانی ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (سورة التوبة)

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ان پاکیزہ مکانات کا جو سدا بہار باغات میں ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے۔ (جو جنت والوں کو نصیب ہوگی) یہی تو

زبردست کامیابی ہے۔ (آسان ترجمہ قرآن: مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

نیز حضرت خاتم الانبیا ﷺ کا فرمان ہے کہ: عن ابی سعید الخدری، قال: قال رسول الله ﷺ: "إن اللہ تبارک وتعالی یقول لاھل الجنة:" یا اھل الجنة"، فیقولون: لبیک ربنا وسعدیک، فیقول: "ھل رضیتم"، فیقولون: وما لنا لا نرضی، وقد اعطیتنا ما لم تعط احدا من خلقک، فیقول: "انا اعطیکم افضل من ذلک"، قالوا: یا رب، وای شیء افضل من ذلک، فیقول: "احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعده ابدا." (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، حدیث : 6549

اوران تکلیفات شرعیہ پرعمل درآمد ہونے کا سب سے اعلیٰ انعام اور اہلِ ایمان کے لیے جنت کی سب سے بڑی نعمت "اللہ تعالیٰ کا دیدار" ہے۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیامة: 22، 23)

اور نبی آخرالزماں ﷺ نے کا فرمان عالی مقام ہے کہ: عن صهيب، عن النبی ﷺ، قال: "إذا دخل اهل الجنة الجنة، قال: يقول اللّٰہ تبارک وتعالی: تریدون شیئا أزیدکم؟ فیقولون: الم تبیض وجوهنا، الم تدخلنا الجنة، وتنجنا من النار؟ قال: فیکشف الحجاب، فما أعطوا شیئا أحب إلیهم من النظر إلی ربهم عز وجل" (صحیح مسلم، رقم الحدیث 449

عبادت کی روح، اللہ کی رضا کے حصول اور اس کی معرفت میں پنہاں ہے، نہ کہ صرف جنت کی مادی نعمتوں میں۔ اسی کو امام غزالی رحمہ اللہ عارفین کا حال ذکر کرتے ہوئے کچھ یوں تعبیر کرتے ہیں کہ و اما الحور و القصور و الفاکهة واللبن و العسل و الخمر و الحلی و الاساویر فانهم لا یحرصون علیها ولو اعطوها لم یقنعوا بها و لا یطلبون إلا لذة النظر الی وجه الله تعالی الکریم .(احیاء علوم الدین، باب التوبة)

باقی حور، قصور، میوے، دودھ، شہد، شراب، زیور اور کنگن، تو وہ لوگ ان چیزوں کی خواہش نہ کریں گے اور ان کو اگر یہ چیزیں دی جائیں گی تو اس پر قناعت نہ کریں گے، ان کا مقصد صرف دیدار الٰہی ہوگا۔ (احیاء العلوم بحوالہ الغزالی مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ صفحہ 162)

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو ☆ کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

(علامہ اقبال)

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذات کی معرفت، اپنی رضا و خوشنودی اور اپنا دیدار؛ نیز نبی آخرالزماں ﷺ کی محبت عطا فرمائے۔ آمین

حسنِ ظاہر میں آپ اجمل ہیں خلقِ باطن میں آپ اکمل ہیں

حذیفہ ایوبی ❖

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت آپ ہی کے ارشاد کے مطابق مکارمِ اخلاق کی تکمیل تھا۔ یہ ایک ایسی جامع و مانع صفت ہے جو انسانی وجود میں موجود تمام اعلیٰ اوصاف کا مجموعہ اور امّ الصفات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وصف کو اختیار کرنے پر غیر معمولی زور دیا۔ جیسا کہ ترمذی شریف میں مروی ہے:
تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

تاریخِ نبوت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے گئے، اور سبھی نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم اور ترویج کی؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس امتیاز کے ساتھ ہوئی کہ آپ کو ان اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کا منصب عطا کیا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض زبانی تعلیم پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنی عملی زندگی میں ایسے نمونے پیش کیے جنہیں دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی۔ آپ کا غایت تحمل، بردباری، عفو اور درگزر ایسا کمال تھا جو عام انسانی فطرت سے ماوراء محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہی وہ اوصاف تھے جن کا مجسم پیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔

اخلاقِ حسنہ میں سب سے اہم خلق شرم و حیا ہے، اس بابت حضرت عائشہ کی زبان مقدسہ و مطہرہ ملاحظہ کیجیے، فرماتی ہیں: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا. " (جس قدر ایک باکرہ اور بے نکاحی لڑکی اپنے پردے میں حیا سے سمٹی اور شرم سے جھکی جاتی ہے رسول اللہ اس سے کہیں زیادہ باحیا تھے۔")

غصہ ایک نہایت طاقتور کیفیت ہے جس پر قابو برسوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بھی آسان نہیں ہوتا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صفتِ عالیہ (یعنی غصے پر ضبط) کے پیکر مجسم تھے۔ جس کے

❖ متعلم لکھنؤ یونیورسٹی

آپ نے امت کے سامنے بے شمار عملی نمونے پیش فرمائے، ان میں ایک نہایت دردناک واقعہ آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش آیا۔ جب وہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئیں تو راستے میں مشرک مکہ حبار بن اسود نے ایسا شدید نیزہ مارا کہ آپ اونٹنی سے گر پڑیں اس وقت آپ رضی اللہ عنہا حاملہ تھیں جس بنا پر آپ کا حمل بھی ساقط ہو گیا جس کا صدمہ آپ کی وفات کا سبب بنا۔

جب یہ کربناک خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نہایت غمگین ہوئے اور طبعاً غصہ بھی آیا۔ روایت میں آتا ہے کہ جب جب آپ کو یہ واقعہ یاد آتا تو چشم نبوت بہہ پڑتیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد جب یہی حبار بن اسود ایمان لے آئے اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر معافی کی درخواست کی، تو رحمتِ عالم ﷺ نے بلا تردد معاف فرما دیا۔

اسی طرح ایک اور نمایاں مثال آپ ﷺ کے عزیز چچا اور سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی بن حرب کا مشہور واقعہ ہے۔ وحشی بعد ازاں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہونے کی درخواست کی۔ رحمتِ عالم ﷺ نے فوراً انہیں دامنِ اسلام میں جگہ عطا کر دی لیکن ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا: "تمہارا اسلام قبول ہے لیکن میرے سامنے مت آنا۔"

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہرگز غصے یا ذاتی منافرت کی بنیاد پر نہ تھا۔ اس کی اصل بنیاد آپ ﷺ کا اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے بے پناہ تعلق اور باپ جیسی محبت تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت نہایت دردناک اور دل خراش تھی اگر وحشی آپ ﷺ کے سامنے آتے تو بے ساختہ وہ منظر تازہ ہو جاتا اور آپ رنجور ہو جاتے اس لیے آپ ﷺ نے احتیاطاً انہیں اپنے سامنے نہ آنے کی ہدایت فرمائی۔ نبی ﷺ کا رنج وحشی کے لئے وبال جان نہ بن جائے۔

ایفائے عہد ایک عظیم ایمانی صفت ہے۔ قرآنِ کریم کے اوراق پر نظر ڈالیں تو متعدد مقامات پر ایفائے عہد انبیاء، صدیقین اور صالحین کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، جبکہ عہد شکنی اور وعدہ خلافی خطہ ارضی کی بدترین قوم یہود کا وطیرہ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اس باب میں بھی اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ اس کی واضح مثال حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ قبولِ اسلام سے قبل اہلِ مکہ نے انہیں کسی غرض سے مدینہ منورہ بھیجا۔ وہاں رسول

اللہ ﷺ کی زیارت نے ان کے دل کی دنیا بدل دی اور انہوں نے فوراً خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے کی درخواست کی۔ مگر حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "میں عہد شکنی اور وعدہ خلافی نہیں کرتا، تمہیں ہر حال میں مکہ واپس جانا ہوگا۔ اگر وہاں جا کر بھی تمہارے دل میں ایمان اور یہی جذ بلقی رہے تو واپس چلے آنا" چنانچہ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ واپس چلے گئے اور کچھ عرصے بعد دوبارہ مدینہ آ کر دامنِ اسلام سے وابستہ ہو گئے۔

غزوات کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے؛ خصوصاً فتحِ مکہ کا باب کھولیے تو رسول اللہ ﷺ کے خُلقِ عظیم کی ایک بے مثال تصویر دنیا کے سامنے آتی ہے۔ وہی مکہ جس کے لوگ ہجرتِ مدینہ سے پہلے آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے، جنہیں آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکت ایک لمحے کو برداشت نہ تھی، جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے آپ کے عزیزوں کو شہید کیا، جو شعبِ ابی طالب میں آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو بھوکا پیاسا چھوڑ آئے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو ہر تکلیف کا حساب لیتے۔

لیکن فتحِ مکہ کے روز جب آپ ﷺ ایک عظیم لشکر کے ہمراہ فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہزاروں کی جماعت ننگی اور خون آشام تلواریں لیے آپ ﷺ کے ہمراہ ایک اشارے کی منتظر تھی۔ پھر بھی زبان نبوت کھلی تو ارشاد ہوا " لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" (آج تم پر کوئی گرفت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو)۔ چاہو تو دامنِ اسلام میں آ جاؤ اور چاہو پروانہ امان حاصل کر لو۔

قارئین! یہ وہی خُلق ہے جس کی مثال نہ اس سے پہلے دنیا نے دیکھی اور نہ قیامت تک دنیا دیکھ سکے گی کیوں کہ خالق کائنات نے آپ کو خلق کے اعلی مرتبے پر فائز کر دیا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَ[illegible]یمٍ یقیناً آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔

مبادیات تاریخ (۱)

محمد احمد مظفرنگر ❖

انسانی معاشرے یا اس کے کسی حصے کے آغاز وارتقاء، اور ترقی وتنزلی کے بارے میں معلومات کا علم تاریخ کہلاتا ہے۔

انسان نے جوں جوں ترقی کی، تہذیب سے شناسائی ہوئی، معاشرتی حالت مضبوط ہوئی ویسے ویسے تاریخ سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تجربات ووقائع اگلی نسل کو منتقل کرنے کی کوشش شروع ہوئی، زبان کے ساتھ ساتھ قلم کو بھی کام میں لایا گیا، فراعنہ کے اہرام، اشوک کی لاٹیں اور حمورابی کے قوانین اسی ذوق کا ثبوت ہیں۔ عمومی لحاظ سے تاریخ ایک یا ایک سے زائد قوموں کے واقعات کا مرتب بیان ہے۔

لیکن اس فن کو جو چیز پیچیدہ بناتی ہے وہ تاریخ کی تعریف ہے، اس سلسلے میں متنوع اقوال اور ان میں موجود تضاد تعریف کو گنجلک بناتا ہے، اس کا ممکنہ سبب بنیادی طور پر تاریخ کا کئی پہلوؤں سے گوناگوں خصائص کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات وارتقاء کا اس کو متاثر کرنا ہے۔ آیئے انہی امور کے سیاق میں چند تعریفات پر نظر ڈالتے ہیں جن سے نہ صرف تاریخ کی تعریفات میں تطبیق اور اس سے حاصل اجمالی خاکہ بلکہ اس فن کے موضوع واغراض اور تعارف واہمیت سے بھی گہری واقفیت حاصل ہوگی۔

تاریخ (History) کا لغوی واصطلاحی مفہوم: لغوی طور پر تو لفظِ تاریخ ایک دن رات، مہینے کا ایک دن، کسی چیز کے ظہور کا وقت، وہ فن یا کتاب جس میں بادشاہوں اور مشاہیر کے حالات درج ہوں، جملے شعر یا فقرے جن کے عدد نکالنے سے مادہ تاریخ نکل آئے، روایات قصوں افسانوں اور جنگ کے معنی میں آتا ہے (فیروز اللغات)۔

❖ متعلم شعبہ تخصص فی العلوم الشرعیہ دار العلوم دیوبند

اس کے علاوہ کسی خاص یامؤثر واقعے سے شروع ہونے والے دور کے لیے نیز اپنے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کے جزوِنام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے تاریخ ہجری اور تاریخ بیت المقدس (یادرہے کہ علمِ تاریخ (historiography) جس پر ہم گفتگو کررہے ہیں اس علم کا نام ہے جس میں وقت کی تعیین کے ساتھ زمانے، اس کے احوال اور متعلقاتِ احوال پر گفتگو ہو۔)

حال کی تہذیب کے تناظر میں تاریخ ماضی کے انہی وقائع و احوال کا مخزن ہوتی ہے۔ ڈچ مؤرخ ہوزنگا (Johan Huizinga,1945-1872) کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ: ''تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔''

تاریخ ماضی کا تسلسل ہے، کسی بھی معاشرے کی مثبت پیش رفت کے لیے ماضی کے آثار و نوادر اور افکار و نظریات کے سیاق میں تاریخ کا علم بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گم کردۂ ماضی قوم بے سہارا ہوجاتی ہے۔ چناں چہ ہر قوم اپنی اصل ماضی کے گم گشتہ آثار میں تلاش کرتی ہے۔ کینتھ برک (Kenneth burke, 1897-1993) کے بقول: ''تاریخ سے مراد انسان کے ماضی و معاشرتی سرگرمیوں کی کہانی ہے'' اور والٹر ریلے (Walter Raleigh,1553-1618) کی نظر میں: تاریخ کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہمیں مثالوں کے ذریعے ماضی کے دور سے ایسی عقل و دانش سکھائے جو ہماری خواہشات و اعمال کی رہنما بن سکے۔

لیکن بدیہی طور پر ماضی کی ہر ہر چیز مؤرخ کے علم میں ہے نہ دلچسپی میں اسی وجہ سے مؤرخ عبداللہ عروی (پ 1933) کہتا ہے: تاریخ جہاں مطلق زمانۂ ماضی کے احوال کے معنی میں آتی ہے وہیں اس کا اطلاق ماضی کے انسانی ریکارڈ پر بھی ہوتا ہے۔

برکہارٹ (Jacob Burckhardt,1818-1897) کے الفاظ ہیں: جو کچھ ایک دور کے متعلق دوسرے دور کے نزدیک لکھ رکھنے کے قابل ہے یا اٹلی کے بینیڈیٹو کروچے (Benedetto croce 1866-1952) کے بقول: پوری تاریخ اصل میں معاصرانہ تاریخ ہے۔ حاصل یہ کہ ماضی بجائے خود موجود ہے، لیکن مؤرخ اپنے پاس موجود ممکنہ مآخذ اور دلچسپی کے باعث منتخب حصہ ہی ریکارڈ کرتا ہے۔

مؤرخ تاریخ سازی نہیں کرتا، وہ اسے دریافت کر کے زندہ جاوید بنا دیتا ہے، گویا وہ ماضی کا ڈھانچہ ازسرِنو تیار کرتا ہے، انسانی شعور کو فعال اور اس کی یادوں کو زندہ کرتا ہے ادھوری تصویروں کو مکمل یا متغیر کرتا ہے لہٰذا: تاریخ زمانہ ماضی ہے اور اس کی یاد بھی۔

تاریخ کی خصوصی دلچسپی گزشتہ ادوار کی انسانی معاشرتی ترقی اوراس کے ارتقائی تسلسل میں ہے،اس میں وہی واقعات ہوتے ہیں جوانسانی سرگرمیوں سے وابستہ ہوں، مافوق الفطرت واقعات یا نیچرل علوم نہ تاریخ کا موضوع ہیں، نہ ان کی تفتیش مؤرخ کی ذمہ داری۔ ہرعلم کا موضوع اس کے حقائق ہوتے ہیں اسی طرح تاریخ کا موضوع ماضی کے حقائق اوران حقائق پرحاوی اصول ونتائج ہیں۔تاریخ کسی بھی دور کے انسانی تجربات کا خلاصہ ہوتی ہے جن سے استفادہ ہرایک کا حق ہے۔ لیوس (Bernard Lewis,1916-2018) کہتا ہے: مطالعہ تاریخ بیمار ذہنوں اورقوموں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی سے واقف ہوتے وقت مؤرخ یا قاری اس کی حقیقت اور احساس کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ چارلس اومین (Charles Oman,1860-1946) کی زبان میں: میرا خیال ہے کہ لفظ تاریخ محض انسان کی ظاہری حالت سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق انسان کی ان سرگرمیوں سے بھی ہے جنہیں ہماری تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے۔

مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں (ابوالحسن علی) مسعودی (956-896) کے بقول قوموں کی سیاسی وغیر سیاسی اور ثقافتی احوال کی تبدیلیوں کے تناظر میں مؤرخ کواس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کسی حکومت کی تبدیلی سے قوم میں کیا کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں اورعرف واصطلاح کے کون کون سے حصے قانون تغیر وتبدل کی نذر ہو چکے ہیں۔ مؤرخ کا فرض ہوتا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت ان امور کے سلسلے میں جو کچھ بس میں ہے اس میں پس وپیش نہ کرے قطع نظر اس انسانی کمزوری کے کہ وہ ماضی کو حال کی نگاہوں سے دیکھتا اوراس کے وقائع کوحال کا لباس پہناتا ہے، وہ انہی واقعات کواہمیت دیتا ہے جوخوداس کی نگاہوں میں اہم ہوں، یہی سوچ مختلف تواریخ کے درمیان فرق کی ایک بنیاد ہے۔ گویا تاریخ مؤرخوں کے نقطۂ نگاہ پرمبنی تعبیرات کا نام ہے۔

تاریخ کی ابتدائی کتب کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اور داستان سرائی یا افسانہ نویسی کی حدود مل گئی ہیں۔اگرداستان اس معنی میں ہو کہ وہ انسان کو متاثر کرتی اوراس کے جذبات کوانگیز کرتی ہے تو پوری تاریخ ہی داستان سرائی نظر آتی ہے۔ لارڈ میکالے (Lord Macaulay, 1800-1859) کے بقول: تاریخ بیان کا ایک فن ہے،اس سے انسانی تاثرات میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے،تصور کے سامنے تصویریں آتی ہیں؛لیکن ضروری ہے کہ مختلف واقعات کو ہنرمندانہ طریقے پر انتخاب کیا جائے، انہیں مناسب ترتیب سے پھیلاؤ دیا جائے اوراپنے دماغ سے کچھ ایجاد نہ کیا

جائے۔غرض یہ کہ کسی بھی معنیٰ کر تعریف کو داستان کہنے کا جواز موجود ہوتا ہم یہ اختراعی افسانہ تو یقیناً نہیں ہے، اس میں وہی کچھ ہوتا ہے اور ہونا بھی ضروری ہے جو ماضی اور اس کے حالات ہی سے ماخوذ ہو، تبھی ماضی کو سمجھنا آسان بھی ہوتا ہے۔لہٰذا: تاریخ کا مطالعہ زمانے کے خیالات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ہر ایک زمانے کے خیالات آئینے کے مانند ہوتے ہیں جن میں اس وقت کے لوگوں کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے فلسفۂ اثبات (positivists) کے متبعین کے مطابق حوادث و واقعات کی تہوں میں کام کر رہی وجوہات کو دریافت کرنا بھی تاریخ کا کام ہے۔تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی کہانی کے ساتھ ساتھ ان کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالتی ہے، تاریخی وقوعے ان تغیرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جو مختلف جگہوں یا زمانوں میں لوگوں کے خیالات و افکار میں رونما ہوتے ہیں لہذا تاریخ کی تعریف اب یہ ہوگی کہ: تاریخ محض حوادث و واقعات کا نام نہیں بلکہ انسان کی اس طویل و عجیب داستان کے اسباب کا نام ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔تاریخ کی اس ابتدا کے بعد مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تاریخ میں انسانوں بلکہ مؤرخین کے خیالات و معاییر اور ان معاشروں کے عروج و زوال کے تناظر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ - جو ایک دوسرے سے مشابہت و اختلاف رکھنے والے انسانوں کا ریکارڈ ہے- یکساں و متنوع ہر قسم کے حالات سے پُر ہے۔موجودہ دور کی دقت یہ ہے کہ ہر گزرتے لمحے میں بڑھتی ہوئی انسانی جدت طرازی، نت نئ ایجادات و احوال کے باعث تاریخ کی افادیت مشکوک ہو رہی ہے وہیں انسانی فکر و عمل کی ایک نئ ہم آہنگی کی ضرورت بڑھ رہی ہے کیوں کہ تاریخ ہمیں انسانی جذبات کی اتھل پتھل سے آشنا کرتی ہے جرمن فلاسفر کریچن وائز (christian wiese,1961) کے بقول: حال کو سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ہمیں حال سے شروع کر کے ماضی کی طرف مراجعت اور پھر حال کی طرف لوٹنا چاہیے۔

یورپ میں بھی مارٹن لوتھر (Martin Luther1483-1546) کے کلیسا سے بغاوت اور تحریک احیائے علوم کے بعد مطالعۂ تاریخ حساس موضوع کے طور پر ابھرنا شروع ہوا، اس کے بعد ہر جگہ اس مضمون کی اہمیت بڑھتی رہی تا آں کہ 20 ویں صدی کے آغاز میں کار (E. H. Carr, 1892-1982) سمیت کئی یورپین مفکرین نے زور دینا شروع کیا کہ تاریخ کو سائنٹیفک

نظریے کے مطابق پڑھا جائے۔ وہیں تاریخ کی ایک نئی تعریف وجود میں آتی (Scientific) ہے: مطالعۂ تاریخ نظریے کا مطالعہ ہے اور نظریات کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔

اس موقع پر ایک اہم موضوع جس کی تفصیل بعد میں ہوگی یہ اٹھتا ہے کہ تاریخ کی اصل قوت واقعات ہیں یا شخصیات جو واقعات کا رخ موڑتی ہیں۔ کارلائل (Richard Carlile, 1790-1843) کا دور شخصیت پرستی کا دور کہلاتا ہے چناں چہ وہ شخصیات کو اصل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ: تاریخی عمل عظیم شخصیتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اس لیے تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح عمریوں سے زیادہ کچھ نہیں، اسی طرح گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe, 1749-1832) اس نظریے کا قائل ہے، وہ کہتا ہے: تاریخ میں مصلحین، شعراء، فنکاروں اور خطیبوں کی وجہ سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے باقی تاریخ سوائے حماقتوں کے اور کچھ نہیں۔

تاریخ کو مزید ایک پہلو سے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ دور قدیم میں مورخین اور شعراء کے بیانات محض ملوک و سلاطین اور ان کے احوال پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ شاید ہی کوئی امر اپنی جانب ان کی توجہات مبذول کراپاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم تواریخ میں خاموش عمومی حالات پر مواد یا تو بے حد کم ہے یا ضمنی اور منتشر، پھر بتدریج رجحان تبدیل ہوا، عمومی فکری، معاشی، سیاسی، معاشرتی وغیرہ قسم کے حالات نیز کسی بھی طور اہمیت رکھنے والے واقعات تاریخ نگاری کا حصہ بنتے گئے اور کہا گیا: تاریخ عوام کی ہوتی ہے۔

یعنی انسان ہی انسان کے بارے میں فیصلے کرتا اور ان فیصلوں سے متاثر ہوتا ہے وہی انفرادی یا اجتماعی تاریخ کو جنم دیتا ہے لہٰذا اب ملوک و سلاطین کے ساتھ ساتھ عوامی ہستیاں اور ان کے افکار و اعمال بھی تاریخ نگاری کا جز ہوں گے جو تخت شاہی پر نہ ہونے کے باوجود اپنی غیر معمولی عزم و عمل سے تشکیل یافتہ شخصیت کی وجہ سے بادشاہوں سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ عوام کی نمائندہ اور معتمد ہوتی ہیں اس وقت: تاریخ کا مطالعہ عوام کے خیالات و افکار کا مطالعہ ہوتا ہے اس زمانے کے عوام کے خیالات اس آئینے کے مانند ہوتے ہیں جس میں اس عہد کے لوگوں کی تصویر نظر آتی ہے

یہیں پر تاریخ شخصی سوانح، فلسفہ اور سیاسیات کا بھی منبع نظر آتی ہے، انہی شخصیات کے تناظر میں لارڈ ایکٹن (-Acton, 1834-John Emerich Edward Dalberg 1902) کا مقولہ مشہور ہے: زبردست اور حد درجہ اثر پیدا کرنے والی شخصیتیں خود اپنے لمبے چوڑے سائے (تاریخ کے) صفحات پر ڈال دیتی ہیں، یہ بڑے آدمیوں کا خاص طریقہ ہے اور بڑا آدمی

متعدد بے داغ مؤرخوں کے برابر قیمتی ہوتا ہے۔

مؤرخ اس کثیر اور بکھرے ہوئے مواد کو سمیٹ نہ پانے کی وجہ سے کسی بھی بنیاد پر پسند اور ترجیح (pick and choose) پر عمل پیرا ہوتا ہے ,اس طرح: تاریخ ماضی کے پسندیدہ اور منتخب شدہ حقائق کا علم ہے۔اس انتخاب میں بعض مؤرخین عصبیت سمیت کسی بھی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں، یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:بعض اوقات تاریخ پسند اور ناپسند کی داستان بن جاتی ہے۔یاد رکھیے تاریخ اتنی ہی صحت مند اور قابل اعتناء ہوگی جتنی کہ اپنے مؤرخ کے ذاتی نظریات، تنگ نظری اور عصبیت سے بالاتر ہوگی۔

حقائق اور وقائع سے مؤرخ کی شناسائی یا بے خبری وکم علمی بھی ایک مؤثر وجہ ہے جو ایک مؤرخ کو ایک نتیجے جبکہ دوسرے مؤرخ کو دوسرے متضاد نتیجے پر پہنچاتی ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ: تاریخ اپنی اصل اور بیانیہ دونوں میں مؤرخ کے بیانیوں کے تنوع کے ساتھ ساتھ انسان کے معاشی، معاشرتی، سیاسی وثقافتی احوال کے تغیر کے باعث تنوعات اور تضادات کا شکار بھی ہے۔ انہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کانٹ (Immanuel Kant,1724-1804) نے آفاقی تاریخ کے نظریات پیش کیے۔ وہ کہتا ہے کہ: تاریخی عمل قوانینِ فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے ,ہرڈر(Johann gottfried von Herder,1744-1803) کے نزدیک تاریخ انسان کی طاقت، عمل اور رجحانات کا فطری عمل ہے جو مکان و زمان کے ساتھ تغیر پذیر ہے، ہیگل(Georg Wilhelm Friedrich Hegel, 1770-1831) کے نزدیک تاریخ کا عمل اضدادی عمل ہے جو اندرونی و بیرونی قوتوں کی کشمکش اور پھر فنا یا تغیر کے ساتھ جاری ہے، انسان اس میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، کارل مارکس (Karl Marx,1818-1883) تاریخی عمل میں انسان کے ارتقاء کو معاشی حوائج کا نتیجہ قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ: تاریخ اقتصادی نظام اور عوامل پیدائش دولت میں تبدیلیوں کی کہانی ہے۔ٹائن بی (Arnold j. Toynbee,1889-1975) تاریخ کو للکار (challenge) اور جواب للکار (response) کے تدریجی ارتقائی عمل اور تہذیب کے عروج و زوال کی داستان بتاتا ہے۔

ماہرِ اجتماعیات وعمرانیات (ولی الدین عبدالرحمٰن معروف بہ)ابنِ خلدون (1406–1332) کے نزدیک تاریخ زمانی تغیرات کے ساتھ ایک جاری و ساری عمل ہے، ماضی، حال اور مستقبل اس

میں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ابنِ خلدون تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "إخبار عن الأیام و الدول و السوابق من التاریخ" یعنی گزشتہ ایام، سابق سلطنتوں، اور پچھلے وقتوں کے لوگوں کی خبر دینا، مصری مؤرخ اور ماہر اقتصادیات (تقی الدین) مقریزی (1442-1364) کے بقول: "التاریخ الإخبار عما حدث فی العالم فی الزمان الماضی" (گزشتہ دور میں جو کچھ دنیا میں ہوا اس کی خبر دینے کا نام تاریخ ہے)۔ اسی میں (جلال الدین) سیوطی (1505-1445) کی تعریف: "ربط الأحداث بالزمن" میں موجود ترتیبِ زمانی کی قید ملحوظ رہے تو خوب وضاحت ہوجاتی ہے۔ تاریخ میں ذرائع اعداد، حوادث اور نام و تاریخیں ہوتی ہیں لہذا: تاریخ ناموں، واقعات، اعداد و شمار اور تاریخ کے مجموعہ کا نام ہے۔

یہ تاریخ کی تعریف میں بہت سے مفکرین کے خیالات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر مفکر نے تاریخ کو اپنے زمانی احوال اور اپنے نظریات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے بعضوں نے تو تاریخ کو لفظِ مشترک بھی قرار دیا ہے۔ اسی بنیاد پر تاریخ کی مختلف تعریفوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تعریفات کو کسی ایک سانچے میں سمویا جاسکتا ہے جو تمام نکات اور اضافوں کو جامع ہو اس قسم کی ہمارے خیال کے مطابق تین تعریفیں ہیں جو سبھی پہلوؤں کو محیط ہوجاتی ہیں:

پہلی تعریف (شمس الدین) سخاوی (1497-1428) کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"التاریخ التعریف بالوقت الذی تضبط به الأحوال ....والحاصل أنه فن یبحث فیه عن وقائع الزمان من حیثیة التعیین و التوقیت بل عما کان فی العالم"

تاریخ وقت کی تعیین کا نام ہے جس کے ذریعے احوال کو منضبط اور محفوظ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ تاریخ ایسا فن ہے جو وقت کی تحدید و شناخت کے ساتھ زمانے بلکہ عالم میں جو کچھ ہوا اس سے بحث کرتا ہے۔

دوسری تعریف مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی (1938-1875) کی ہے جو اپنی کتاب تاریخِ اسلام کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

علم تاریخ اصطلاح میں اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بادشاہوں، نبیوں، فاتحوں اور مشہور شخصیتوں کے حالات اور گذرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان واقعات و مراسم وغیرہ معلوم ہوسکیں اور جو زمانۂ گزشتہ کی معاشرت، اخلاق، تمدن وغیرہ سے واقف ہونے کا ذریعہ بن سکے۔

تیسری اور آخری ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبداللہ الشیخ کی اپنی کتاب المدخل الی علم التاریخ میں کی گئی تعریف ہے:

"فالتاريخ عند أكثر الباحثين يتناول كل ما يتعلق بجهود الإنسان في الماضي سواء كانت هذه الجهود و تلك النشاطات لحكام أو زعماء أو لأفراد عاديين و سواء كانت هذه النشاطات حروبا أم علاقات سلمية أو نشاطات في مجالات الفن والاقتصاد والتعليم والدين و ما إلى ذلك."

اکثر محققین کے مطابق انسان کی ماضی میں سرگرمیوں سے متعلق تمام چیزیں تاریخ میں شامل ہیں یہ سرگرمیاں اور دلچسپیاں چاہے مقتدر افراد کی ہوں یا لیڈروں اور عام افراد کی، نیز وہ فعالیتیں جنگوں یا پرامن علائق سے وابستہ ہوں یا آرٹ، پیشہ، معاش تعلیم اور مذہبی شعبوں سے۔

یہ تعریفات و ابحاث انشاء اللہ فنِ تاریخ سے قاری کے کافی حد تک شناسائی کے سیاق میں بے حد مفید ثابت ہوں گی۔

تاریخ کی تاریخ، تاریخ کی اقسام اور اس کے معاون مستقل یا ضمنی علوم، تاریخ کے قدیم و جدید اصول، تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ اور اسلامی تاریخ کے امتیازات پر انشاء اللہ قسط وار گفتگو کی کوشش ہوگی۔

(قسط اوّل)

نظریۂ ارتقا؛ عہد بہ عہد

عامر ایاز بجنوری❖

نظریۂ ارتقا انسانی فکر کے اُن نظریات میں سے ہے جنہیں تاریخِ انسانی میں غیر معمولی شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ایک ایسا فکری وفلسفیانہ نظریہ ہے جسے مادہ پرستوں اور مذہب بیزاروں نے اپنی مزعوم تہذیب وثقافت کی بنیاد بنایا۔ فطرت کے قوانین کی مادی تعبیر اور کائنات میں زندگی کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے بھی اسے اہم سمجھا گیا۔

یہ نظریہ دراصل اسی فکری وسائنسی سلسلے کی توسیع ہے جس کی جڑیں قدیم انسانی مشاہدات، تجربات اور قیاسات میں پیوست نظر آتی ہیں۔ مختلف ادوار اور تہذیبوں میں انسان نے کائنات، زمین اور جانداروں کی ابتدا وارتقا کے بارے میں اپنے اپنے انداز سے تصورات قائم کیے۔ کبھی یہ تصورات اساطیر اور مذہبی روایات کی صورت میں پیش ہوئے، اور کبھی فلسفیانہ استدلالات اور سائنسی مشاہدات کی شکل میں۔ یونانی، مصری، ہندی اور چینی؛ الغرض تقریباً سبھی تہذیبوں کے فکری ذخائر میں زندگی کی ابتدا اور جانداروں کی تدریجی تبدیلی کے بارے میں منتشر خیالات ملتے ہیں، جن کو انیسویں صدی میں ایک منظّم فلسفیانہ وسائنسی نظریے کا قالب عطا کیا گیا نیز اسی صدی میں اس نظریہ کو سائنس، مشاہدات اور مختلف قیاسات کی تائیدات کی بنا پر عقل انسانی کی ایک لازوال دریافت کے طور پر متعارف کرایا گیا۔

نظریۂ ارتقا کیا ہے

کسی چیز کے آہستہ آہستہ ترقی کرنے کو evolve کہتے ہیں اسی سے evolution (ارتقاء) بنا ہے اور اسی کا بالمقابل (opposite، متضاد) devolution ہے یعنی کسی چیز کا آہستہ آہستہ تنزلی اور زوال کی طرف بڑھنا۔ (Devolution of the darwins delusion)

❖ متعلم تکمیل تفسیر دارالعلوم دیوبند

ارتقاءکواصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے:

"Evolution is the process by which the physical characteristics of types of creatures change over time, new types of creatures develop, and others disappear (Cambridge dictionary)

ارتقا، وہ عمل ہے جس کے ذریعے جانداروں کی اقسام اپنی جسمانی خصوصیات میں وقت کے ساتھ تبدیلی لاتی ہیں، نئی انواع پیدا ہوتی ہیں اور بعض ختم ہوجاتی ہیں۔

ارتقا کی اقسام:

نظریۂ ارتقائے حیات وکائنات بنیادی طور پر دوطرح کا ہے:

میکانکی ارتقااور غایاتی ارتقا: میکانکی ارتقا کا نظریہ میکانکیت اور ارتقا کے امتزاج کا نتیجہ ہے جسے ڈارون، ٹینڈل، تھامس، ہکسلے اور لیپلس نے پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق تمام کائنات اپنے تمام مشمولات کے ساتھ پہلے سے موجود منتشر مادے اور قوت سے، کسی خدا یا عاقل ناظم یا اصول عاقل کی رہنمائی اور ہدایت کے بغیر ترقی وارتقا کے عمل سے گزر کر آہستہ آہستہ اپنی اس موجودہ صورتحال تک پہنچ پائی ہے۔ کچھ یقینی واٹل، بے شعور اور اندھی میکانکی طبیعی قوتیں لاکھوں کروڑوں سال کے دوران ان تبدیلیوں کا سبب بنی ہیں۔ لہٰذا اس کارخانۂ عالم کے پیچھے نہ تو کوئی خدا موجود ہے اور نہ کائنات کی غرض وغایت ہے۔ ہر شئی حرکت اور مادے کے قوانین کے مطابق از خود پیدا ہورہی ہے۔ یہ نظریہ میکانکیت اور مادہ پرستوں کا مقبول عام نظریہ ہے۔

ارتقائے حیات کا دوسرا نظریہ غایاتی ارتقا کا نظریہ ہے میکانکی ارتقا اور غایاتی ارتقا کے نظریات تقریباً ایک جیسے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے جو ان دونوں کو الگ الگ کرتا ہے وہ یہ کہ میکانی ارتقا خدا اور کسی عاقل وقادر اصول اولیہ کا انکار کرتا ہے جبکہ غایاتی ارتقا کا نظریہ، خدا اور کسی عاقل وقادر اصول اولیہ کا انکار نہیں کرتا بلکہ یہ قرار دیتا ہے کہ حیات وکائنات کے ارتقا کے پیچھے کوئی ذہین اصول یا خدا کارفرما ہے جو اس تمام نظام کی دیکھ بھال کررہا ہے اس نظریہ کو قدیم یونانیوں میں انکساغورث، سقراط، افلاطون، ارسطو اور جدید فلسفیوں میں تمام تصوریت پسند فلسفیوں مثلاً ہیگل، فشنز، ونڈٹ اور پالسن نے پیش کیا ہے (تاریخ الحاد مغرب ص:502)

نظریۂ ارتقا کا تاریخی پس منظر:

تھیلز (Thales: 624??546 ق م) قریب ڈھائی ہزار سال پہلے تھیلز (Thales: 624??546 ق م) نامی ایک عظیم فلسفی اور ماہر فلکیات گزرا۔ اس کا تعلق ملطیہ (Miletus) شہر سے تھا۔ یہ توحید پرست تھا۔ اسے دنیا کے سات عظیم داناؤں میں شمار کیا جاتا ہے اور ایونیائی مکتبِ فکر (Ionian School) کا بانی بھی مانا جاتا ہے۔

یہ سب سے پہلے اس نے یہ تصور پیش کیا کہ: پانی کی حیثیت اشیاء کی اصل ہونے کی ہے

"الماء أصل الأشياء" (Alkhaleej ae) (پانی اشیاء کی بنیاد ہے)

مشتاق احمد وجدی لکھتے ہیں کہ تھیلز کے نزدیک: یہی وہ ابتدائی عنصر ہے، جس سے سب چیزیں وجود میں آئی ہے اور آخر میں سب چیزیں پھر پانی ہو جائیں گی، نیز اس نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ:

"لا شے سے کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی" "دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے"۔(ارتقاص:۷)

امام محمد بن عبدالکریم شہرستانی رح اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الملل والنحل" جلد ثانی کے ص:۶۷ پر رقم طراز ہیں کہ: سب سے پہلی مخلوق "پانی" ہے۔ اس لیے کہ پانی ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی سے تمام جواہر (آسمان، زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں) کو بنایا گیا۔ وہی ہر مخلوق کے پیدا ہونے کا بھی سبب ہے اور ہر جسمانی عنصر کے مجموعہ کے پیدا ہونے کا بھی۔

تھیلز کے فلسفے کی مزید تفصیل ذکر کرتے ہوئے امام شہرستانی رح تحریر فرماتے ہیں: پانی کی سختی سے زمین بنی، اس کے لطافت سے ہوا وجود میں آئی، پانی کی صفائی سے آگ پیدا ہوئی، اور دھوئیں اور بخارات سے بادل اور پانی کی قسمیں وجود میں آئیں۔ اور اثیر (یعنی لطیف ترین مادہ) کے احاطہ سے فلکِ اعظم بنا۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا کہ اس کے نزدیک پانی عنصر اول ہے اور وہ ہر شکل کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اسے یہاں مشکل یہ پیش آئی کہ جب اس نے یہ مانا کہ " عنصر اول ہر شکل کو قبول کرتا ہے یعنی تمام اشکال کا منبع وہی ہے" تو کے لیے اس نے عالم جسمانی میں ایک ایسی مثال پیش کرنا چاہی جو اشکال کو قبول کرنے میں اس کے موازی آسکتی ہو؛ لیکن اسے اس نہج پر پانی کی طرح کوئی ایسا عنصر نہ مل سکا جس کو وہ مبدأ اول کی مثال کے طور پر پیش کر سکے، لہٰذا اس نے مرکبات میں

پانی کومبدأاول قرار دے دیا۔

خود اس کی مذہبی اور آسمان کتاب "تورات" میں مذکور ہے کہ "مبدأ خلق وہ جوہر ہے جس کو اللہ نے پیدا کیا پھر اس کو ہیبت اور جلال کی نظر سے دیکھا تو اس کے اجزاء پگھل کر پانی بن گئے پھر پانی سے دھوئیں کی طرح بخارات اٹھے اس سے آسمان کو پیدا کیا اس کے بعد سطح زمین پر سمندر کی جھاگ کی طرح جھاگ نمایاں ہوا، اس سے زمین کو پیدا کیا پھر اس کو پہاڑوں سے مضبوط کیا"

ایسا لگتا ہے کہ تھیلز اسی نبوی چراغ سے اپنے مذہب کو روشنی اخذ کر کے اس نظریہ کا قائل ہوا ہو۔ (الملل والنحل ص:68)

ان نظریات کو اول اول دنیا کے سامنے پیش کرنے کی بنیاد پر تھیلز کو مغربی فکر کے نظری؟ ارتقا کے سفر میں ایک مرکزی حیثیت عطا کی گئی۔ ان کی ان تحقیقات نے آنے والی نسلوں کے فلسفیوں اور سائنس دانوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، جس سے مستقبل کے فلاسفر کے فہم وادراک میں (ان کے گمان کے مطابق) ایک ایسی تبدیلی ممکن ہوئی جو توہم پرستی اور روایات کے بہ جائے مشاہدے اور عقل پر زور دیتی تھی۔ اس دور میں، جب کہ کائنات کو اکثر اساطیری زاویے سے سمجھا جاتا تھا، تھیلز نے دنیا کی اساطیری تشریحات سے عقلی اور سائنسی تشریحات کی طرف منتقلی کا آغاز کیا اور یوں اس نے گہری فلسفیانہ جستجو کے لیے میدان ہموار کیا۔

(The Philosophical Context of Thales Doctrines in Ancient Greece)

قدیم یونان کے متنوع سماجی وسیاسی پس منظر میں، تھیلز صرف ایک مفکر ہی نہیں؛ بلکہ ارتقا کے ایک علم بردار کے طور پر ابھرا جس نے رائج خیالات کو چیلنج کیا۔ ان کی تعلیمات، خاص طور پر "آرکے" (arche)} اولین اصول کا تصور {نہ صرف حقیقت کو سمجھنے کے نئے در، وا کرنے کا سبب بنی؛ بلکہ بعد میں آنے والے ممتاز فلسفیوں کو بھی متاثر کیا

(The Philosophical Context of Thales Doctrines in Ancient Greece)

اناکسی مینڈر (546Anaximander 610 ق م)

تھیلز کے بعد اناکسی مینڈر نے اس فلسفے کو نئے بال و پر عطا کیے اور اس میں تازہ افکار کا اضافہ بھی کیا۔

اول اول: "اس نے یہ مفروضہ قائم کیا تھا: زندگی کی ابتدا سمندر سے ہوئی تھی اور انسان

جانوروں سے وجود میں آیا تھا" (نظریہ ارتقاو تصور تخلیق: عصری مباحث کا جائزہ ص:25)

اس نے ایک تصور "اپیرون" (Apeiron) کا بھی پیش کیا— جس کا مطلب ہے لامحدود، بے کنار، غیر متعین اور ہمیشہ حرکت میں رہنے والا، جو فطرت اور کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا تھا، خاص طور پر اس کی ابتداء میں دلچسپی رکھتا تھا۔ مثال کے طور پر، ان کے مطابق دنیا کبھی مکمل طور پر پانی سے ڈھکی ہوئی تھی، اور جب زمین ابھر کر سامنے آئی تو گرم اور سرد، یا تر اور خشک کے درمیان ایک دائمی کشمکش شروع ہوگئی۔ زندگی اسی مرطوب ماحول سے وجود میں آئی، یا تو سمندر سے یا گیلی، کیچڑ بھری تہوں سے، اور آبی مخلوقات— خواہ انسان ہوں یا جانور— ارتقا پذیر ہونے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے یہ نظریات مختلف جانوروں کے جنین (Fetus) کا مشاہدہ کرنے کے بعد سامنے آئے، کیونکہ انہوں نے نتیجہ نکالا کہ یہ سب مچھلی سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ اگر جنین طویل عرصے تک رحم میں رہیں تو ایک تبدیلی (Mutation) واقع ہوسکتی ہے۔ اگرچہ یہ نظریات متنازع ہیں، لیکن بعد کی تحقیق اور فقاری جانداروں (Vertebrates) کے ارتقاء کی سمجھ میں کچھ مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے قدیم فقاری جاندار بے جبڑے مچھلیاں تھیں، جنہوں نے وقت کے ساتھ ہڈیاں، ریڑھ کی ہڈی اور جبڑے پیدا کیے۔ بعد کے ارتقاء میں یہ پانچ گروہوں میں تقسیم ہوئے: مچھلیاں، امفیبیئن (دونوں خشکی اور پانی میں رہنے والے جانور)، رینگنے والے جاندار، ممالیہ، اور پرندے۔

تیسری صدی کے رومی مؤرخ سینسورینس (Censorinus) کے مطابق:

ملطیہ کے اناکسی مینڈر کا خیال تھا کہ زمین پر گرم پانی سے مچھلیاں یا مچھلی جیسے جاندار پیدا ہوئے۔ انہی جانداروں سے انسانی شکل وجود میں آئی اور وہ جنین کی طرح اس وقت تک مقید رہے جب تک وہ بلوغت کو نہ پہنچ گئے۔ پھر جب یہ جاندار پھٹ کر کھل گئے تو مرد اور عورت باہر نکلے اور اپنی خوراک خود حاصل کرنے کے قابل ہوگئے۔"

1- The Ancient Theory of EvolutionAnaximander
Submitted by Iza on Mon,

2- (Was evolution invented by greek philosophy by : benno zuiddam)

اناکسی مینڈر کا امتیاز:

اس فلسفی کو اول الذکر سے اس پہلو میں امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ اس نے پہلے پہل یہ کہنے کی جرأت کی کہ جان دار مادہ بے جان مادے سے وجود میں آیا اور یہ کہ انسان کے آباء واجداد جانور تھے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اور سب جانور بہت جلد اپنی غذا تلاش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں صرف انسان ہی کو ایک عرصے تک ماں کے دودھ پر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے خاندان بنا کر رہنے کے متعلق اس کا بھی خیال تھا جو آج کل سائنس کے علماء کا ہے (ارتقاص:8)

اناکسی مینڈر کا علمی سرمایہ:

اس کی تحریروں اور کتابوں میں سے بیشتر؛ بلکہ تمام تر علمی سرمایہ زمانہ کے خرد برد کی شکار ہو گیا اور مرور زمانہ سے ان کا علم بھی نہ ہو سکا؛ البتہ ارسطو(aristotle) کی کتابوں میں اس کے خیالات ملتے ہیں اور وہیں سے اس کے نظریات کی تفصیلات بھی لوگوں کے سامنے آئی۔

انکسارغورث(anaxagoras 500__428ق م)

اس کا تعلق بھی تھیلز کے شہر "ملطیہ" سے تھا، تھیلز سے وحدانیت کے مسئلہ میں اتفاق رکھنے کے باوجود مبدأ اول میں اس سے اختلاف رکھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ مبدأ موجودات در اصل وہ (جسم اول) چھوٹے چھوٹے اجزاء ہیں جو اس قدر لطیف و باریک ہیں کہ حس، ان کے شعور وآگہی سے عاجز ہیں اور عقل ان کی ماہیت دریافت کرنے سے درماندہ ہے۔ان ہی اجزاء سے پورے عالم علوی وسفلی کو وجود بخشا گیا (الملل والنحل ص:69)

نیز وہ پہلا شخص ہے جو کمون وظہور کا قائل ہوا؛ وہ اس طرح کہ اس نے پہلے تمام اشیاء کو جسم اول میں مخفی مانا اور اس کے بعد وجود کو اس جسم سے نوع، صنف، مقدار اور شکل وغیرہ میں ظاہر ہونے والی شئ تصور کیا؛ ٹھیک اسی طرح جیسے ایک دانے سے خوشے، ایک گٹھلی سے تازہ کھجوریں، ایک کمزور نطفے سے مکمل شکل وصورت کے انسان اور انڈوں سے پرندے نکل پڑتے ہیں، سو یہ سب کمون (مخفی) سے ظہور اور بالقوہ سے بالفعل وجود میں آنا ہے، تخلیق اول ایک ہی شئ کی ہے اور وہ جسم اول کے علاوہ دوسری کوئی شئ نہیں۔

نظریۂ انکساغورث اور جدید ارتقا:

انا کساغورث کا نظریہ ارتقا سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس نے قدرتی انتخاب (natural selection) یا جینیاتی تبدیلیوں (genetic mutations) کی بات نہیں کی، جو جدید نظریہ ارتقا کے بنیادی اصول ہیں۔ اس کا زور کائنات کے بنیادی اجزاء اور ان کی ترتیب پر تھا، نہ کہ وقت کے ساتھ جانداروں کی تبدیلی پر۔

خلاصہ یہ کہ انکساغورث نے کوئی براہ راست نظریہ ارتقا پیش نہیں کیا؛ لیکن اس کے نظریات کو جدید ارتقائی نظریات کا پیش خیمہ سمجھا جاسکتا ہے، خاص طور پر پینسپر میا کے حوالے سے۔

اناکسی مینیز (588_524anaxi menes قم)

اسی مکتبہ فکر کے ایک اور فلاسفر اناکسی مینیز (588_524anaxi menes قم) ہے اس نے کہا کہ کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا ہے، یہ ہوا غیر متعین مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے، ہوا مسلسل حرکت میں ہے، اور حرکت کا یہ اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے، اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقا کا باعث بنا (ارسطو حیات وتعلیمات، فکر و فلسفہ)

ایمپیڈوکلیز (,Empedocles وفات 434قم)

ارسطو کے تقریباسو برس بعد "ایمپیڈوکلیز "(Empedocles وفات 434قم) پیدا ہوا یہ کلاسیکی فلسفیوں میں سے ایک ہے، اس نے بھی ارتقا کے ابتدائی تصورات پیش کیے اس نے وجود کو چار لا فانی، نا قابل تغیّر بنیادی عناصر کے ملاپ سے جوڑا: زمین، آگ، ہوا، پانی۔ یہ عناصر خود کبھی پیدا نہیں ہوتے اور نہ ہی فنا ہوتے ہیں؛ صرف ان کے ملاپ بدلتے ہیں۔

تبدیلی کی بنیادی وضاحت یہی تھی کہ ہر مادّہ ان عناصر کی مختلف مقدار اور ترتیب کا نتیجہ ہے— یعنی وجود کا ماخذ ان کی ترتیب ہوتی ہے(encyclopedia.com)۔

"ارسطو"(348--332قم aristotle)

ایک مشہور فلسفی اور ماہرِ حیوانات گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقی معنوں میں صرف چار ہی حکماء

ہیں: دو اسلام سے پہلے اور دو اسلام کے بعد۔ اسلام سے پہلے کے حکماء میں ارسطو اور ابوقراط کے نام ملتے ہیں، جبکہ اسلامی دور کے حکماء میں ابونصر فارابی اور ابوعلی بن سینا شمار کیے جاتے ہیں۔ (حکماء الاسلام، ص30)

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ارسطو کی علمی حیثیت اور اس کی قدر و قیمت کس درجے بلند ہے۔

How did aristotle contribute to the)"radeley gray" theory of evolution) مضمون میں لکھتے ہیں:

"قدیم یونانی فلسفی "ارسطو" نے حیاتیات اور جانوروں کی درجہ بندی میں نمایاں شراکت کی۔ اگرچہ انہوں نے ارتقا سے متعلق کوئی پیشگی (Darwinian-Pre) نظریہ پیش نہیں کیا؛ مگر ان کے مشاہدات اور نظریات نے آنے والے سائنس دانوں کے لیے بنیاد فراہم کی۔

ان کی سب سے اہم شراکت یہ تھی کہ انہوں نے جانداروں کے درمیان "یگانگت" (Unity of Plan) کو سمجھا۔ وہ مانتے تھے کہ تمام جاندار اپنی عادات اور رہائش گاہوں کے مطابق جسمانی اور فعلیاتی (Functional) طور پر ڈھل جاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ کائنات کی تمام مخلوقات ایک مربوط نظام ہیں، نہ کہ بے ربط گروہوں کا مجموعہ۔

اگرچہ ان کی درجہ بندی بعض اوقات غلط تھی، لیکن ان کی کتاب "تاریخ الحیوانات" (History of Animals) حیاتیات کی تاریخ میں ایک سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ یہی سے علمِ حیوانیات (Zoology) کا آغاز ہوا، اور ان کی مشاہدات نے بعد میں ڈارون، لینیس اور والیس جیسے سائنس دانوں کے مطالعے کی راہ ہموار کی"

ارسطو کا حیاتیات کا مطالعہ دراصل ان کے ما بعد الطبیعیاتِ جوہر (Substance Metaphysics) کے بنیادی اصولوں کی عکاسی کرتا ہے، جو ہائلومورفزم hylomorphism (مادہ اور صورت کی ترکیب)، غائیت (مقصدیت)، ماہیت (Essence)، اتفاق (Chance) اور ضرورت (Necessity) کے تصورات پر قائم تھی، اور یوں وہ قدیم فلاسفہ (Socratics-Pre) کی مادی اور ریڈکشنسٹ وضاحتوں کے مخالف کھڑے رہے

(An aristotelian account of evolution and the contemporary philosophy of biology By:mariusz tabaczek)

ارسطو کے نظریہ ارتقاء کا خلاصہ یوں کیا جاسکتا ہے۔

ارسطو نے زندگی کو ایک منظّم سلسلے Scala Naturae—یا "Chain of Being"—میں رکھا، جہاں مادی چیزیں سادہ سے پیچیدہ کی طرف بڑھتی ہیں۔ ہر نوع (species) اپنی جگہ پر مستقل ہوتی ہے، کسی بنیاد پر تبدیل نہیں ہوتی۔

(History of Evolutionary Thought)

2. Teleology — ہر چیز کا مقصد ہوتا ہے

وہ فطرت کو مقصدیت (teleology) کے تناظر میں سمجھتا تھا: ہر چیز کسی خاص غرض کے لیے وجود میں آتی ہے، یعنی "nature does nothing in vain"۔ فطرت کسی بھی شیء کو بے سود پیدا نہیں کرتی۔ (Nature does not do anything in vain)

3. بائیولوجیکل فرق اور اتفاق (Variation and Chance)

ارسطو نے کچھ محدود تبدیلیاں تسلیم کیں جو اسی نوع کے اندرونی فرق (intraspecies variation) کے باعث ہوتی ہیں، جیسے مختلف ماحول یا موسمی حالات کی وجہ سے۔ اگر چہ وہ ان تبدیلیوں کو evolution یا نوع کی تبدیلی نہیں سمجھتا۔ (Pontifical academy of science)

4. Epigenesis — وجود میں آنے کا تدریجی عمل اس نے بیان کیا کہ جاندار امبریو (embryo) ایک غیر مخصوص مادہ سے ترتیب وار ترقی کرتا ہے (epigenesis)، جو ایک "form" یا "soul" سے متاثر ہوتا ہے جو اسے مشخص شکل دیتا ہے۔

(encyclopedia of philosophyStanford)

اس تفصیل کی روشنی میں اگر موجودہ نظریہ ارتقا (ڈارون ازم) اور ارسطو کے نظریہ ارتقا کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارسطو کے نزدیک نوع مستقل رہتی ہے، مگر اردگرد کے حالات اور ماحول کی وجہ سے اس نوع کے اندر فرق آ سکتا ہے۔ وہ ایک teleological فریم ورک میں سوچتے ہیں، جہاں ہر چیز باطنی مقصد کے تحت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، ڈارون کے نزدیک نوع بدلتی ہے، اور وہ ارتقا کا بنیادی عمل قدرتی انتخاب (chance) اور اتفاقی تغیرات تسلیم کرتا ہے؛ بغیر کسی اندرونی غرض کے۔

جارج لوئی لے کلیرک، کومتے دے بوفون (- louis Leclerc,comte de

(Georges buffon 1007__1788ق م)

"جارج لوئی لے کلیرک، کومتے دے بوفون ایک فرانسیسی ماہرِ قدرت اور رئیس تھے۔ انہوں نے 1740ء کی دہائی میں یہ نظریہ پیش کیا کہ انواع وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور بعض ہمیشہ کے لیے معدوم بھی ہو جاتی ہیں، حالانکہ اُس زمانے میں بیشتر سائنس دان اسے ناممکن خیال کرتے تھے۔ اپنی 36 جلدوں پر مشتمل مشہور تصنیف Historie naturelle میں انہوں نے یہ نظریات تفصیل سے بیان کیے۔ بوفون نے زمین کی عمر اربوں سال قرار دی اور جانداروں کا مطالعہ اُن کے قدرتی ماحول میں کر کے ماحولیاتی علم (Ecology) کی بنیاد ڈالی۔"

رابرٹس کے مطابق:

''انہیں دنیا کا پہلا ماہرِ ماحولیاتیات (ecologist) کہا گیا ہے، کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے کسی نوع کا اس کے اصل ماحول میں مطالعہ کیا، نہ کہ صرف مردہ نمونے کا۔

(Buffon was one of the very first people to postulate the change of species over time)

(The French aristocrat who understood evolution 100years before Darwin –and even worried about climate change...By:donna ferguson)

بوفون کی اہمیت اس سے مزید بڑھ جاتی ہے، جب "اوریجن آف اسپیشیز" کے نئے ایڈیشنز میں ڈارون نے جارج لوئی لے کلیرک، کومتے دے بوفون کو اُن چند لوگوں میں شمار کیا جنہوں نے ڈارون سے پہلے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ انواع (species) بدلتی اور ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔

"Donna ferguson" اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

بوفون ان اولین لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے یہ تصور پیش کیا کہ انواع وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں بوفون نے تولید میں کسی اندرونی قالب (internal mould) کے وجود کا تصور پیش کیا جو بعد میں ڈی این اے کی دریافت سے مشابہ ثابت ہوا۔ وہ انسانی سرگرمی سے پیدا ہونے والی آب و ہوا کی تبدیلی پر بھی فکرمند تھا۔۔ بوفون ان اولین لوگوں میں بھی شامل ہے جنہوں نے یہ تصور پیش کیا کہ جانور معدوم ہو رہے ہیں — یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب زیادہ تر ماہرینِ فطرت کا یقین تھا کہ ''خدا کبھی کسی نوع کو ختم یا پیدا ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔'' رابرٹس کے مطابق، ''نوع کی تبدیلی اور معدومیت کا تصور اس وقت انتہائی متنازع تھا۔

''ڈونا فرگوسن'' مذکورہ مضمون میں یہ انکشاف بھی کرتی ہیں کہ:

بوفون کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ دنیا اُن کے خیالات سننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اکثر اپنے بیانات میں بائبل کی تردید کے بعد فوراً یہ جملہ شامل کردیتے:

"لیکن بلاشبہ یہ محض بے بنیاد قیاس ہے، کیونکہ بائبل اس کے برعکس کہتی ہے۔"

(The French aristocrat who understood evolution 100years before Darwin –and even worried about climate chang)

لامارک1829-1744ق م)(Baptiste Lamarck-Jean)

فرانس کا رہنے والا یہ سائنسدان علم الحیوانات کا ماہر تھا ارتقا کا نظریہ باقاعدہ سب سے پہلے لامارک نے ہی پیش کیا تھا اس نے اپنی کتاب "فلسفہ حیوانات" جو 1809 میں شائع ہوئی تھی اپنا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا لامارک کے نظریے کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ مانی جاتی ہے کہ اس نے اس نظریہ کو مکمل یقین کے ساتھ پیش کیا کہ سارے جاندار لاکھوں کروڑوں سالوں کے ارتقائی تسلسل سے وجود میں آئے ہیں اور اس نے اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح اس ارتقائی سلسلہ عمل میں ایک نوع کے جاندار دوسرے نوع کے جانداروں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں (ڈارون اور اس کا نظریۂ ارتقاص:20)

لامارک کے نظریۂ ارتقا کے دو قوانین اور دو بنیادیں ہیں:

(ا) قانون توارث حقیقت: اس کا مطلب ہے کہ کسی فرد میں جو اکتسابی خصوصیات ہوتی ہے وہ بھی موروثی ہو جاتی ہے یعنی آگے آنے والی اولادوں میں وہ خصوصیات منتقل ہو جائیں گی اس کی مثال اس نے ژرافہ کی گردن سے پیش کی ژرافہ کی گردن لمبی ہونے کی وجہ سے، جس کو اس نے وضاحت کے طور پر اس طرح پیش کیا کہ: چونکہ ژرافہ جنگلوں میں رہتا ہے اور اس کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے اونچے اونچے درختوں تک پہنچنا پڑتا ہے اس کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے گردن لمبی کرنی پڑتی ہے، گردن کو بار بار نمبر کھینچ کر لمبی کرنے کی وجہ سے کافی زور لگانا پڑتا ہے اس مستقل جدوجہد کی وجہ سے اس کی گردن بھی ہوگئی ژرافہ کی لمبی گردن والی خصوصیت آئندہ والی نسل میں بھی منتقل ہوگئی۔ (انسانی ارتقا کی کہانی ص:55)

لامارک کے نظریہ کی دوسری بنیاد:

(۲) قانون استعمال و ترک استعمال: کبھی جانور اپنے ایک حصے کو زیادہ استعمال کرتا ہے اور دوسرے حصے کو کم استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کو زیادہ استعمال میں لائے گا وہ زیادہ طاقتور ہوگا

جس حصے کو کم استعمال کرے گا وہ کمزور ہوتا رہے گا۔

(Devolution of the darwins delusion: ص 11)

لامارک کی تھیوری جس میں نظر ارتقا کو پہلی بار مدلل انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی، بہت عرصے تک اپنی سالمیت برقرار نہ رکھ سکی؛ لیکن لامارک کا ایک کارنامہ ضرور ہے کہ اس کی تھیوری کے مدلل انداز نے لوگوں کو نظریۂ ارتقا کے بارے میں زیادہ مدلل انداز میں سوچنے پر مجبور کیا۔اس لیے میرا خیال ہے کہ ڈارون ازم لامارک کے فلسفے سے کسی طور بے نیاز نہیں رہ سکتا، حال ہی میں اویس اقبال نے قیصر احمد راجہ کے ساتھ ایک اسٹریم میں اس کا باقاعدہ اقرار کیا۔

ڈوپامین اور سوشل میڈیا

(Dopamine and Social Media)

امجد حسین ارریاوی ❖

موجودہ دنیا ایک بستی نما ہے، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک کوزہ میں بند ہوگئی ہے، اب آپ منٹوں میں پوری دنیا کی خبروں پر واقفیت حاصل کر سکتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید کے انسانوں نے زمان و مکان کی تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک نئ دنیا بسا لی ہے؛ جہاں فاصلوں کے بجائے فریکوئنسیز ہیں، اور موجودگی کے بجائے بڑے بڑے اسکرینز کا وجود غالب ہے۔ اس نئ دنیا کا نام "سوشل میڈیا (SocialMedia)" ہے، جو بظاہر ربط و تعلق کا ایک بہترین ذریعہ ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے انسانی شعور، جذبات اور نفسیات کو مکمل طور اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے اور ان پر خاموش مگر گہرا وار کر رہا ہے اور اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے؛ اس کی سب سے باریک اور پر فریب چال دماغی کیمیکل ڈوپامین سے جڑی ہوئی ہے، جو ہمیں بار بار اس رنگین مگر فریب دہ دنیا کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈوپامین کیا ہے تو اس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ڈوپامین انسانی دماغ کا وہ کیمیائی مادہ ہے جو خوشی، مسرت اور تسکین کا احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ فخریہ احساس ہے جو آپ کو کسی کامیابی پر محسوس ہوتی ہے، یا پھر آپ کا محبوب معمولی توجہ کے ساتھ آپ کی جانب مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوجائے؛ جب کہ آپ ان کی ایک توجہ کے لیے ترس رہے تھے۔ آپ اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کسی خوشی اور کامیابی کے حصول پر عجیب سی گدگدی پیدا ہوتی ہے، دل میں فخریہ احساس جاگتا ہے اسی احساس اور گدگدی کا نام ڈوپامین ہے؛ اس زاویے سے دیکھیں تو یہ بڑی اچھی چیز ہے؟ مگر مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب یہ کیمیائی مادہ کسی فطری اور حقیقی

❖ فاضل دارالعلوم دیوبند متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تجربے کے بجائے مصنوعی اور ورچوئل ذرائع سے متحرک کیا جانے لگے۔سوشل میڈیا ہماری اسی فطری خوشی کی تلاش کو نوٹیفکیشنز، لائکس، کمنٹس اور فالورز کی صورت میں ڈوپامین کا فریب دے کر تسکین کا متبادل فراہم کرتا ہے اور ہمیں ہماری توجہ اور مقصد سے ہٹا کر ایک فضول اور لغو چیز کا عادی بنا دیتا ہے۔

سچ پوچھیے تو سوشل میڈیا ایک جدید طرز کا نشہ ہے، ایسا نشہ ہے جسے ہم نشہ تصور بھی نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی ہم سوشل میڈیا انسٹاگرام، فیسبک، تھریڈز وغیرہ پر کوئی نئ پوسٹ ڈالتے ہیں اور اس پر لائکس کی تعداد بڑھتی ہے، یا کوئی ویڈیو وائرل ہو جاتی ہے، تو ہمارے دماغ میں ڈوپامین خارج ہوتا ہے۔ جبکہ یہ ایک چھوٹا سا "ریوارڈ سسٹم (Reward System) ہے؛ جو ہمیں بار بار اس عمل کو دہرانے پر آمادہ کرتا ہے کہ ہم دس منٹ میں دس بار سوشل میڈیا آن کرتے ہیں، یوں سوشل میڈیا ایک نفسیاتی لت (Psychological addiction) میں تبدیل ہو جاتا ہے، ہم حقیقی تعلقات اور گہرے تجربات سے دور ہو کر محض ری ایکشنز" کے محتاج بن جاتے ہیں۔نقصان اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہماری توجہ مقصد سے ہٹ جاتی ہے، مقصد پر توجہ مرکوز ہونے کے بجائے ہم بے مقصد کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ ذرا آپ ہی غور کیجیے کبھی انسان کتاب کی ایک سطر پر گھنٹوں غور کرتا تھا، آج اسے ایک ویڈیو کلپ بھی بور کر دیتا ہے۔کبھی تحقیق وجستجو ایک فن تھا، آج وہ گمشدہ ورثہ بن چکا ہے۔سوشل میڈیا کے شارٹ کلپس، مسلسل اسکرولنگ، اور فوری تسکین نے ہماری توجہ کو منتشر کر دیا ہے۔انسان اب تفکر نہیں کرتا، صرف ردعمل دیتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ سوشل میڈیا نے جہاں اظہار کو عام کیا ہے، وہیں تفکر، تدبر اور تعمق جیسی اقدار کو مجروح بھی کیا ہے؛ لوگ اب کم پڑھتے ہیں، زیادہ دیکھتے اور لکھتے ہیں؛ کم سنتے ہیں، زیادہ بولتے ہیں اور کم سوچتے ہیں، زیادہ شیئر کرتے ہیں؛ یہ تبدیلی صرف ظاہری نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری سطح پر بھی انسان کو سطحیت کا اسیر بنا رہی ہے۔

سوشل میڈیا کا دعوی ہے کہ وہ پوری دنیا کو مربوط کرتا ہے، کنیکٹ کرتا ہے، یقیناً کرتا ہے؛ لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ سوشل میڈیا نے انسانی زندگیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے، جدا کر دیا ہے؛ بلکہ سوشل میڈیا نے ہمیں ایک دوسرے سے اور خود اپنی ذات سے بھی کاٹ دیا ہے اور مسلسل کاٹ رہا ہے؛ ہماری گفتگو اب ایموجیز (Emojis) میں ہوا کرتی ہے، جذبات GIFs میں، اور دکھ Reels میں۔دل کی بات کہنے کا ہنر۔

آنکھوں کی زبان، خاموشی کا وقار سب کچھ رفتہ رفتہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں "دکھ کو بھی filteraesthetic کی ضرورت ہوتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں اب اس کا حل تلاش کرنا چاہیے، یہ ایک مرض ہے، جس کا علاج فوری ہونا چاہیے؛ ورنہ یہ عارضی مرض حقیقی اور فطری زندگی کے لیے مرض الموت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں چند باتوں کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ پہلی بات یوزر میں ڈیجیٹل شعور کا ہونا بہت ضروری ہے: تفصیل یہ ہے کہ ایک سوشل میڈیا یوزر کو یہ علم ہونا چاہیے کہ سوشل میڈیا کو استعمال کیسے کرنا ہے؟ کیا دیکھنا ہے اور کن چیزوں سے پرہیز رہنا ہے؟ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ سوشل میڈیا کو بطور آلہ استعمال کرنا ہے، مقصد نہیں بنانا ہے۔

دوسری بات یوزر وقت کی حد بندی کرے: یعنی ایک سوشل میڈیا یوزر کے لیے انتہائی مفید اور ضروری امر یہ بھی ہے کہ ہر دن کے کچھ حصے کو مکمل طور پر ڈیجیٹل دنیا سے علیحدہ رکھے، لاکھ نوٹیفکیشنز آئے، آنے دیں، سوشل میڈیا کی طرف نہیں جانا ہے، سوشل میڈیا کے ایپس کے لیے ٹائم لمٹ ضرور سیٹ کریں۔

تیسری بات گہرے مطالعے کی عادت ڈالنا: دراصل ہماری زندگی کتابوں سے ہٹ گئی، اگر کچھ حد تک باقی بھی ہے تو تلخیص (Summary)، شارٹ اسٹوری اور گائڈس تک، لہذا کتابوں سے رشتہ استوار رکھیں تا کہ دماغ کو فکر کی خوراک ملتی رہے، کیوں کہ مطالعہ کے بغیر دماغ انجماد کا شکار ہو جاتا ہے۔

چوتھی بات حقیقی تعلقات کو وقت دینا ہے: ہوتا یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ہمارے سینکڑوں دوست ہیں، سوشل میڈیا پوسٹ کے ذریعے یا تبصرہ خانہ میں ہماری گفتگو اس انداز کی ہوتی ہے کہ ہم بڑے ہی خوش مزاج شخصیت کے حامل ہیں، حالانکہ حقیقی زندگی بد سے بدتر ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ جب اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے اور رشتے داروں کے پاس بیٹھیں تو ان کے ساتھ مکمل توجہ کے ساتھ گفتگو کریں، جسمانی ساخت کے اعتبار سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیں۔

پانچویں بات خود احتسابی لازمی ہے: دن کے اختتام پر خود سے سوال کریں کہ "میری توجہ آج کہاں صرف ہوئی؟ آج میرا کتنا وقت سوشل میڈیا پر خرچ ہوا، کتنا وقت ہم نے ہمارے اپنوں کو دیا، کتنا وقت خود کو دیا اور کتنا وقت مثبت اور کتنا وقت منفی استعمال کیا؟ اس طرح کے سواالت کریں گے تو اپنے اور اپنوں دونوں کے لیے سود مند ہوگا۔

بات کا خلاصہ یہی ہے کہ ڈوپامین بذات خود مسئلہ نہیں، بلکہ یہ تو فطرت کا عطیہ اور انعام ہے، مسئلہ تب جنم لیتا ہے جب انسان اس قدرتی نظام کو مصنوعی تسکین کے لیے استعمال کرنے لگے، سوشل میڈیا ایک آئینہ ہوسکتا ہے اگر ہم اسے شعور، توازن اور مقصدیت کے ساتھ برتیں؛ مگر اگر یہ آئینہ ہماری اصل کو ہی دھندلا کردے، تو یہ محض ایک فریب رہ جاتا ہے؟ ایک ایسا فریب جو ہمیں خوشی کا احساس تو دیتا ہے، مگر سچائی سے دور لے جاتا ہے، وقت آچکا ہے کہ ہم اپنے وجود، اپنی توجہ اور اپنے شعور کو Reclaim کریں؛ تاکہ ہم صرف مربوط (Connected) نہ ہوں، بلکہ باخبر بھی ہوں، بامقصد بھی ہوں اور بامعنی بھی ہوں۔

ملی گوشہ

غزہ میں بھوک مری

اسباب اور مستقبل کے امکانات

عبدالعلیم الاعظمی ❖

غزہ میں اسرائیلی جارحیت کے 670 دن گذر چکے ہیں،اس دوران اسرائیل نے ہر ممکنہ طریقے سے اہل غزہ کی نسل کشی کی کوشش کی ہے۔اس جنگ میں ایسے ایسے ہتھیار استعمال کئے ہیں کہ انسانیت بھی شرمسار ہوجائے۔اسرائیلی قابض ریاست جب غزہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور غزہ کے ایک ایک چپے کو چھان مارنے کے باوجود فوجی آپریشن کے ذریعہ اپنے قیدیوں کو واپس لانے میں ناکام رہی تو اس نے " بھوک" کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ اس جارحیت کے آغاز یا ابتدائی دنوں میں اسرائیل نے بھوک کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ بلاشبہ اسرائیل اس نسل کشی کے ہر مرحلہ میں بھوک کو ہتھیار اور اہل فلسطین پر دباؤ ڈالنے کے مؤثر طریقے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ البتہ پہلے دکھاوے کے نام پر چند امدادی ٹرک داخل ہوجاتے تھے؛لیکن جنوری کی جنگ بندی کے بعد اسرائیل نے امداد کے داخلہ پر مکمل پابندی لگادی ہے،جس کی وجہ سے غزہ کی صورتحال ناقابلِ بیان ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھوک مری کا شکار بن کر اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، بزرگ خواتین اور مرد حضرات راہ چلتے بھوک کی کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ ماؤں کے پاس کھانے کا ایک نوالہ تک نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں میں بھوک سے تڑپتے اور بلکتے لختِ جگر کو کھلاسکیں۔ 200 سے زائد لوگ بھوک مری کی وجہ سے حالیہ چند دنوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔جن میں اکثریت بچوں کی ہے۔

اسرائیل بھوک مری کو ہتھیار کے طور پر کیوں استعمال کر رہا ہے؟ اس کے پیچھے اسباب اور

❖ تجزیہ نگار و متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

منصوبے کیا ہیں؟ اس بھوک مری کے اہل فلسطین اور فلسطینی مزاحمت پر کیا اثرات پڑیں گے؟ دنیا بھر کے ممالک غزہ کی کربناک صورتحال کو کب تک دیکھ سکتے ہیں؟ کیا سقوط غزہ قریب ہے؟ بھوک مری کے اس جنگ پر کیا اثرات پڑیں گے؟ زیر نظر مضمون میں ہم ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جنوری کی جنگ بندی کے بعد جب اسرائیل نے دوبارہ جارحیت شروع کی تو اس نے بھوک کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے، اس کے پیچھے اسرائیل کے درج ذیل مقاصد ہیں:

ا۔ مزاحمت بھوک مری اور غزہ کی کربناک صورتحال کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے یا کم از کم اسرائیلی شرائط کے مطابق جنگ بندی پر تیار ہو جائے۔

۲۔ اس جنگ میں اسرائیل کے بہت سے مقاصد اور منصوبے صرف اس وجہ سے بھی ناکام ہوئے ہیں کہ فلسطین کی عوام کا صبر واستقامت اس کے درمیان حائل تھا۔ بھوک مری کے پیچھے سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ عوام کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ بھوک اور مسائل سے دوچار ہو کر مزاحمت کے خلاف ہو جائیں اور حماس کو اندرونی مسائل اور مخالفت کی وجہ سے کمزور کیا جا سکے، اور عوامی مخالفت کی وجہ سے مزاحمت جنگ بندی کے لئے مجبور ہو جائے۔

یہ سطور لکھے جانے تک 2000 سے زائد لوگ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں، غزہ کی بہت بری صورتحال ہے۔ ہر گذرتے لمحے کے ساتھ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی دباو کے باوجود غزہ میں کوئی امداد داخل نہیں ہو رہی ہے۔ چند ممالک اسرائیل کے اشارے پر فضائیہ سے معمولی قسم کی امداد گرا رہے ہیں، جو کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مانند ہے۔ اس کربناک صورتحال میں بھی اہل فلسطین صبر واستقامت کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کا اندازہ تھا کہ اس طرح کی صورتحال میں اہل فلسطین کا صبر اور ضبط جواب دے گا؛ لیکن اندازوں کے برعکس اہل فلسطین پہلے ہی کی طرح چٹان کی مانند کھڑے ہیں اور اس جارحیت اور نسل کشی میں استقامت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اسرائیل جن مقاصد کے لئے بھوک مری کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا، ابھی تک صورت حال کے اعتبار سے اسرائیل کو اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے؛ بلکہ بھوک مری کی وجہ سے اسرائیل کو بھی بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

غزہ میں جوں جوں صورتحال خراب ہوتی جا رہی ہے، مغربی ممالک میں عوام کی طرف سے ان کی حکومتوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مغربی ممالک اسرائیل کے خلاف ہو گئے

ہیں اور عالمی قانون کے خلاف ورزی پر اسرائیل کے خلاف بولنا شروع کر دیا ہے اور بہت سے ممالک نے فلسطینی ریاست کو قبول کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے۔

عالمی طاقتوں اور اداروں کی ناکامی اور خاموشی کے بعد عوام نے خود سے ہی غزہ کے لوگوں کو امداد پہنچانے کا بیڑا اٹھایا؛ چناں چہ شمالی افریقہ کے عرب ممالک نے "قافلة الصمود" کے ذریعہ غزہ کے حصار کو توڑنے اور مصری حکومت پر دباؤ بنانے کی کوشش کی۔ یکے بعد دیگرے دو مرتبہ عوامی کشتیوں کے ذریعہ غزہ کے حصار کو توڑنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن اسرائیل فوج نے غزہ سے بہت پہلے کشتی کو روک دیا تھا اور کارکنان کو گرفتار کر لیا تھا، اس حصار کو توڑنے کی کوشش میں کئی اہم مغربی شخصیات بھی تھیں، جن میں ممبران پارلیمنٹ وغیرہ بھی شامل تھے۔

حالیہ جنگ کے دوران پہلی مرتبہ حماس کی مرکزی قیادت نے مصر کی عوام، حکومت اور فوج کو مخاطب کیا ہے اور غزہ میں بھوک مری کے دوران رفح کراسنگ کھولنے کی اپیل کی۔ مصر پر عالم اسلام کی طرف سے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، گزشتہ کچھ دنوں میں متعدد ممالک میں مصری سفارت خانے کے باہر احتجاج ہوا ہے اور رفح کراسنگ کھولنے اور غزہ میں امداد داخل کرنے کی اپیل کی گئی۔ مصر پر اندرونی اور بیرونی دباو کے اثرات ہیں کہ اس دوران مصری صدر کو کئی مرتبہ وضاحت کرنی پڑی ہے، مصری صدر نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ رفح کراسنگ مصر کی طرف سے کھلی ہے دوسری طرف سے بند کی گئی ہے۔ مصری صدر نے اس دوران اپنے ایک بیان میں حالیہ جنگ میں پہلی مرتبہ اس جنگ کو نسل کشی قرار دیا ہے اور اس کا مقصد سیاسی حصول یابی یا قیدیوں کی رہائی کے بجائے فلسطینی کاز کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ مصری صدر کی بار بار وضاحت سے معلوم ہو رہا ہے کہ مصر میں سب کچھ اچھا نہیں چل رہا ہے، حکمراں اور فوج کو بھی عوامی مخالفت اور بغاوت کا احساس ہو رہا ہے۔ غزہ کی صورتحال مزید بگڑے گی تو مصر اور اردن پر گہرے اثرات پڑیں گے۔

بھوک مری کے شکار اسرائیلی قیدی بھی ہیں، قسام اور القدس بریگیڈ نے گزشتہ دنوں دو اسرائیلی قیدیوں کی ویڈیو جاری کی تھی، جس میں وہ بھوک کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور دکھائے گئے ہیں۔ اس کے اثرات اسرائیل میں پڑ رہے ہیں، اسرائیل سے بھی اس بھوک مری کے خلاف آواز بلند ہونے لگی ہے۔ اسرائیلی قیدیوں کے اہل خانہ کشتیوں کے ذریعہ غزہ میں امداد پہنچانے کی کوشش کی تھی، جس کو اسرائیل نے غزہ کے ساحل سے پہلے روک لیا تھا۔

اسرائیل سیاسی قیادت نے گزشتہ دو تین دنوں میں غزہ پر قبضہ اور غزہ کو اسرائیل کا حصہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا ہے، اگر چہ اسرائیل کی فوجی قیادت میں اس تعلق سے زبردست اختلاف ہے، فوج اس منصوبہ کے خلاف ہے۔ اگر اسرائیل اس منصوبہ پر قائم رہا ہے تو وہ مزید عالمی حمایت سے محروم ہو جائے گا، اور اسرائیل پر مغربی ممالک کی طرف سے مزید دباؤ ڈالا جائے گا۔ غزہ پر اسرائیل کا قبضہ تو ممکن ہے۔ لیکن یہ قبضہ وقتی طور پر ہی ہوسکتا ہے۔ قبضہ کے لئے اسرائیل کے پاس دو راستے ہیں یا تو فلسطینی قوم کو مکمل طور پر ختم کر دیں، جو کہ ناممکنات میں سے ہے، دوسرے یہ کہ فلسطینی قوم کو غزہ سے نکال دیا جائے، دوسری صورت عرب ممالک کے لئے مشکلات لائے گی، ان بڑی تعداد میں مہاجرین، خاص طور سے جن کے ساتھ ظلم وستم ہوا ہے اور مجبور کر کے اپنے وطن سے نکالا گیا ہے، بڑے مسائل پیدا کریں گے اور کوئی بھی عرب ممالک اس کے لئے راضی بھی نہیں ہوگا۔ غزہ پر قبضہ کا منصوبہ اس طور کامیاب ہوسکتا ہے کہ اسرائیل غزہ میں کسی عرب ملک کو مہرہ کے طور پر استعمال کرے کہ اس کی حکومت ہو۔ اسرائیل وزیر اعظم نے اس طرح کے اشارات بھی کئے ہیں۔ پھر یہ عرب حکومت دھیرے دھیرے حماس کا خاتمہ کرے گی اور پھر اسرائیل کا منصوبہ کامیاب ہوگا۔

غزہ جن مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے، بلاشبہ ان حالات میں ہر شخص کی زبان پر ''مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ'' ہے اور ہر شخص ''اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ'' کا منتظر ہے۔ غزہ جس طرح کی صورتحال سے گذر رہا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس جنگ کو بند ہونا چاہئے عالم اسلام کے حکمرانوں اور عالم اسلام کی جید شخصیات کو آگے آنا چاہئے اور زبانی یکجہتی اور اسرائیل کی مذمت سے آگے نکل کر غزہ کے تعلق سے سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے۔ بلاشبہ ان حالات میں پورا مغرب عوامی سطح پر غزہ کے ساتھ اور سرائیل کی مخالفت میں کھڑا ہے۔ مغربی حکومتیں بھی پہل کر رہی ہیں اور اس نسل کشی اور بھوک مری کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان حالات میں عالم اسلام کی خاموشی کربناک ہے۔ بلاشبہ اپنے حالیہ منصوبوں میں اسی طرح ناکام ہوگا، جس طرح وہ اپنے ابتدائی منصوبوں میں ناکام ہوا تھا۔ خدا پر یقین اور بھروسہ ہے کہ ایک لاکھوں مسلمانوں کا خون ضائع نہیں ہوگا۔ یہ حصار، جبر اور ظلم ختم ہونے والا ہے۔ خدا اپنے نیک اور مظلوم بندوں کی حفاظت کے لئے وقت کے تاتاریوں سے کام لے سکتا ہے، وقت کے فرعونوں سے بھی حامیان موسیٰ کی حفاظت فرما سکتا ہے۔ دشمن اور اسلام مخالف جماعت اپنا منصوبہ بناتی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ ان منصوبوں کو ناکام بناتا ہے۔ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ

خَیْرُ الْـمٰکِرِیْنَ ان شااللہ صہیونیوں کے منصوبے ناکام ہوں گے اور اہل اسلام سرخرو ہوں گے۔ وَ کَـانَ حَـقًّـا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور غزہ سے اسلام کا پرچم لہرائے گا اور اسلامی تہذیب وتمدن کا سورج طلوع ہوگا، جس کی ضیا پاش کرنوں سے مغربی ممالک کے مردہ دل بھی روشن ہوجائیں گے۔
وَرَاَیتَ النَّاسَ یَدخُلُونَ فِی دِینِ اللّٰہِ اَفوَ□جا

''الشریف'' غزہ کا شاہد بھی شہید بھی

ریحان احمد اعظمی ❖

1996ء میں جبالیہ کیمپ میں آنکھ کھولنے والے اس مردِ مجاہد نے انتہائی مختصر عمر پائی، محض 29 / سال کی بھری جوانی میں شہادت سے خدا نے سرفراز کر دیا، مگر اللہ نے جو کام ان سے لیا ہے وہ مثل آفتاب ہمیشہ غزہ کے مفلوک الحال اور مظلوم مسلمانوں کی پیشانی فخر سے بلند کرتا رہے گا۔ وہ امت مسلمہ کے ان نایاب ستاروں میں سے تھے جنہیں اللہ نے امت کی مظلوم ترین جماعت کی بے مثال ترجمانی کا کام سونپا تھا، یعنی وہ صحافت کے بادشاہ تھے جنہیں پوری دنیا سنتی تھی۔ ابتداء جنگ سے اب تک 240 / صحافیوں کو صہیونیت نے نشانہ بنایا ہے۔

جو کہ افغانستان، عراق، شام، ویتنام، یوگوسلاویہ، لیبیا، کوریا اور یوکرین سمیت WW2 کے بعد کے تمام تنازعات کے تمام مارے گئے صحافیوں سے زیادہ ہے۔ مگر انس الشریف کی شہادت کا غم ہر غم سے سوا ہے

کیونکہ انہوں نے ابتدا سے اپنی انتہا تک غزہ کی نسل کشی اور جینوسائڈ کا اکیلا نہیں بلکہ پوری دنیا کو چشم دید گواہ بنایا ہے۔ جس کے کیمرے نے دنیا کی آنکھوں پہ چڑھی منافقت کی پٹی کو کھول کر حقیقت سے روبرو کر دیا۔ جنہوں نے اپنی قوت واستعداد سے بڑھ کر وہ فرض منصبی نبھایا ہے جسے امت خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ عرب کے مسلمانون کی توہین کو اس نے دنیا کی ہر آنکھ کے سامنے پروس دیا۔

میں کچھ دن پہلے ان کی اس رپورٹنگ کو نہیں بھول سکتا، جب لائیو آن لائن ان کی آنکھ سے آنسو چھلکا ہے جنہیں مظلوموں کی بھوک و پیاس اور مسلسل شہادت کے غم نے نڈھال کر دیا تھا تو ایک راہگیر نے ان سے کہا، "اپنا کام جاری رکھو، جاری رکھو، انس! جاری رکھو، تم ہماری آواز ہو۔" انہوں

❖ استاذ مدرسہ دار العلوم مدنیہ گنگوہ

نے اپنے اعصاب پہ قابو کیا اور غزہ اور اس کے لوگوں کی خاطر ان کے زخموں، ان کے کمزور جسم، اور عربوں کی ترک وطن کے درد کے لئے اپنی تکلیف اور اپنی بھوک سے اوپر اٹھ کر اپنی رپورٹ مکمل کی۔ ایک سچا صحافی اپنے وطن کی محبت، لوگوں کے اطمینان اور اعتماد پر، اپنے ٹھوس نظریہ پر رکھی ہوئی امیدوں پر، "شاید" پر پروان چڑھتا ہے اور انس الشریف ایسے ہی تھے۔

جس زمانے میں توپ وتفنگ اور راکٹ ومیزائل سب سے بڑا ہتھیار تصور کیے جاتے تھے لوگ ان کی مثالیں دیا کرتے تھے آج کے زمانے کا سب سے مضبوط اور توانا ہتھیار کیمرا ہے جس کی ہر تصویر دشمن کیلئے ایک اسنائپر شارٹ ہوتی ہے۔

انس الشریف اور ان کے ساتھی محمد قریقرع کی 10 اگست کی شہادت محض ایک جنگی جرم نہیں ہے جس کا ایک طویل اور تاریک ریکارڈ ہے۔ بلکہ یہ تباہی کا ایسا باب ہے جو مکمل تزویراتی اور اخلاقی دیوالیہ پن کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ صرف خبر نہیں ہے بلکہ دشمن کی ایک مری ہوئی حالت کی نشانی ہے، اور "ثقافتی سیلاب" کی جنگ میں ایک سنگ میل ہے جو دنیا کے شعور کو نئی شکل دے رہا ہے۔

دشمن نے یہ سوچا کہ انس کی آواز کو دبا کر ہم جنگ جیت جائیں گے؛ مگر ایسا نہ ہو سکا انس جو کل تک ہر منظر کا شاہد تھا آج وہ شہید ہو چکا ہے مگر شہادت کہاں انسان کو مرنے اور فنا ہونے دیتی ہے وہ تو جاوید بنا کر رہتی دنیا تک کیلئے اسے نیک نامی کا تمغہ عطا کر دیتی ہے اور ظالم کے ماتھے کا کالک بنا دیتی ہے۔

600 / ایام سے زائد دنوں کا عرصہ گزر گیا ہے اور غزہ میں روز آنہ اسرائیل مظلوم فلسطیوں کے قتل عام کا مرتکب ہو رہا ہے جسے کوئی روکنے والا نہیں ہے مزید برآں نتن یاہو کہتا ہے کہ اگر ہم غزہ میں جینوسائڈ کرنا چاہیں تو صرف آدھے دن مین انہیں ختم کر سکتے ہیں جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ موجودہ جینوسائڈ کو جرم ہی نہیں مانتا ہے۔

اتوار، 10 اگست 2025 کی شام، غزہ کی پٹی میں طبی ذرائع نے صحافی محمد قریقہ اور فوٹو گرافروں ابراہیم داہر اور محمد نوفل کے ساتھ، ایک پریس ٹینٹ پر جہاں وہ الشفاء میڈیکل کمپلیکس کے سامنے ٹھہرے ہوئے تھے، پر اسرائیلی فضائی حملے کے نتیجے میں ان کی شہادت ہوئی تھی۔

ان کی زندگی کی سب سے مضبوط اور جامع وصیت ان کی شہادت کے بعد نشر کی گئی جو ہر درد رکھنے والے دل کیلئے اندوہناک حقیقت اور غم کا سبب اور ہر زندہ آنکھ کیلئے خون کے آنسو بہانے کی وجہ ہے۔

'یہ میری وصیت اور میرا آخری پیغام ہے۔ اگر یہ الفاظ آپ تک پہنچ جائیں تو جان لیں کہ اسرائیل مجھے قتل کرنے اور میری آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے آپ سب کو السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ جانتا ہے کہ جب سے میں نے جبالیہ پناہ گزین کیمپ کی گلیوں اور کوچوں میں آنکھ کھولی ہے، تب سے میں نے اپنے لوگوں کا سہارا اور آواز بننے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں اور طاقتیں صرف کر دیں۔ میری امید تھی کہ اللہ میری عمر دراز کرے گا تا کہ میں اپنے اہل خانہ اور عزیزوں کے ساتھ اپنے اصل شہر عسقلان (المجد ل) واپس جا سکوں۔ لیکن اللہ کی مرضی پہلے آئی اور اس کا فیصلہ حتمی ہے۔

میں نے زندگی درد میں گزاری ہے، بارہا مصائب وحوادث کا مزہ چکھا ہے، پھر بھی سچائی کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بیان کرنے میں نے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی نہ کبھی میرے پاؤں مین جنبش آئی، تا کہ اللہ کے سامنے ان لوگوں کے خلاف گواہی دے سکوں جو خاموش رہے، جنہوں نے ہمیں قتل ہونے کیلئے بے آبرو اور بے سہارا چھوڑ دیا جنہوں نے جیتے جی ہمارا گلا گھونٹ دیا، اور جن کے دل ہمارے بچوں اور عورتوں کے جسم کے بکھرے ہوئے چیتھڑے دیکھ کر بھی نہ پھٹے۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا مگر ان میں کوئی حرارت و جنبش ایمانی پیدا نہیں ہوئی، اسلئے میں فلسطین کو آپ کے حوالے کرتا ہوں جو کہ مسلم دنیا کے ماتھے کا جھومر اور امت کے سر کا تاج ہے، اس دنیا کے ہر آزاد انسان کے دل کی دھڑکن ہے۔ میں اس کے لوگوں، اس کے مظلوم اور معصوم بچوں کو آپ کے حوالے کرتا ہوں جن کے پاس کبھی خواب دیکھنے یا سلامتی اور سکون سے رہنے کا وقت نہیں ملا۔ جن کے پاکیزہ جسم ہزاروں ٹن اسرائیلی بموں اور میزائلوں کے نیچے کچلے گئے، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دیواروں پر بکھر گئے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ (غلامی اور ملکی مذہبی سرحدی) زنجیریں آپ کو کبھی خاموش نہ کر سکیں اور نہ ہی سرحدیں آپ کو روک سکیں۔ اس سرزمین اور اس کے لوگوں کی آزادی کے لیے آپ بنیان مرصوص بن جائیں، جب تک کہ ہمارے لوٹے ہوئے مقبوض وطن پر عزت وقار اور حریت وآزادی کا سورج طلوع نہ ہو جائے۔ میں اپنے خاندان کی حفاظت کا ذمہ آپ کے سپرد کرتا ہوں، میں اپنی پیاری بیٹی شام کو آپ کے سپرد کرتا ہوں، جو میرے آنکھوں کی روشنی، جسے میں اس کے

حسین خوابوں کے ساتھ بڑا ہوتے نہ دیکھ سکا، میں اپنے پیارے بیٹے صلاح کوآپ کے سپرد کرتا ہوں، جس کا میں زندگی کے ہر موڑ پہ ساتھ دینا چاہتا تھا جب تک کہ وہ اتنا مضبوط نہ ہو جائے کہ وہ میرا بوجھ اٹھا سکے اور میرے مشن کو جاری رکھ سکے۔

میں اپنی پیاری ماں کو آپ کے حوالے کرتا ہوں، جن کی دعاؤں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا، جن کی دعائیں میرے لئے ایک حصار اور قلعہ تھیں اور جس کی عطا کردہ روشنی نے ہمیشہ میری راہنمائی کی۔ میں ان کیلئے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں طاقت صبر و ہمت عزم و استقلال عطا فرمائے اور انہیں میری طرف سے بہترین انعامات سے نوازے۔

میں اپنی عمر بھر کی ساتھی، اپنی پیاری بیوی ام صلاح (بیان) کو آپ کے سپرد کرتا ہوں، جن سے جنگ نے مجھے کئی دنوں اور مہینوں تک الگ رکھا۔ اس کے باوجود وہ ہماری رفافت کے ساتھ قائم و دائم رہیں زیتون کے درخت کے تنے کی طرح ثابت قدم رہیں جو نہیں جھکتا — صبر کرنے والی، اللہ پر بھروسہ کرنے والی، اور اپنی پوری طاقت اور ایمان کے ساتھ میری غیر موجودگی میں ذمہ داری نبھانے والی تھیں۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ کھڑے رہیں، اللہ تعالی کے بعد ان کا سہارا بنیں۔ اگر میں مروں گا تو اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہوں گا۔ میں اللہ کے حضور گواہی دیتا ہوں کہ میں اس کے فرمان پر راضی ہوں، اس سے ملنے کا یقین رکھتا ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہترین اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

اے اللہ مجھے شہداء میں قبول فرما، میرے پچھلے اور آئندہ گناہوں کو معاف فرما اور میرے خون کو ایسا نور بنا جو میری قوم اور میرے اہل وعیال کے لیے آزادی کی راہ روشن کرے۔ اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا، اور مجھے اپنی رحمت کے سائے مین جگہ دینا ا، کیونکہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور کبھی اس میں کوئی تبدیلی یا خیانت نہیں کی۔

غزہ کو مت بھولنا ... اور میرے لئے مغفرت کی دعا کرتے رہنا اور میری شہادت کے قبولیت کی دعا کرتے رہنا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

گل گشتِ ادب

مکتوب نگاری

قاضی عمر بارہ بنکوی ❖

مکتوب نگاری فنونِ لطیفہ کا حصہ نہ ہونے کے باوجود بھی بہت سے فنون سے زیادہ لطیف اور شائستہ فن ہے۔ بعض لوگوں نے اسے لطیف ترین فن بھی کہا ہے۔ جس طرح دیگر فنون خونِ جگر مانگتے ہیں ایسے ہی خطوط نگاری بھی خامۂ خوں چکاں چاہتی ہے۔ دنیا کے بہترین خطوط نگار وہی لوگ ہوئے ہیں جو زندگی کے تپتے ریگ زاروں پر سینے کے بل چلے ہیں۔ خطوط کے فنکاروں نے اپنے سحر انگیز قلم سے ذاتی اور شخصی غم والم کی داستانوں کو کبھی دردانگیز لب ولہجہ میں بیان کیا تو کبھی اسے طنز ومزاح کا پیراہن دے کر شگفتہ بنادیا۔

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہو یا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا بہت مشکل ہے۔ ہر اس تحریر کو جو خط کے فارم میں لکھی گئی ہو مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ بعض اوقات اس فارم میں انشا پردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں یا ان کی تحریر کا محرک کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط اور قاضی عبدالغفار کے لیلی کے خطوط کا وہ محرک نہیں تھا جو خط لکھنے کا ہوتا ہے۔ آزاد کے خطوط اچھے انشائیے ہیں اور لیلیٰ کے خطوط دلچسپ ناول۔

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ کسب فن کی ضرورت نہیں، کسی استاد سے اصلاح مشورہ بھی ضروری نہیں۔ موٹی موٹی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ سے پہلے اساتذہ اس فن میں کیا کیا کمالات دکھا گئے ہیں پھر بھی خط کے لیے قلم اور دوات سے زیادہ اور کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی فن تحریر کی۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب

❖ متعلم شعبۂ انگریزی دارالعلوم دیوبند

انسان درخت کے پتوں، دھات کی پلیٹوں، چمڑوں اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔

انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہل روم کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنائیں۔ ادبی مؤرخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لیے بھیجے جاتے تھے، اپنے صوبے کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے خط و کتابت ناگزیر تھی۔

جب عرب میں اسلام رونما ہوا تو عرب میں یہ فن غیر ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ خط لکھنا ایک پیشہ تھا اور اس پیشے کے اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی کی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے خط و کتابت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار دارالاِنشا قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا باقی تمام صوبوں میں سرکاری سطح پر ایسے محکمے قائم کیے گئے دارالاِنشا صرف لائق اور قابل لوگوں کو سپرد ہوتا۔

مکتوب نگاری محض ایک ذریعۂ پیغام رسانی نہیں بلکہ احساسات، خیالات اور تہذیبی شعور کے منتقل کرنے کا فن بھی ہے۔ یہ دلوں کو جوڑنے، فاصلے گھٹانے اور وقت کے پردے چاک کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔ ماضی میں یہ فن سلطنتوں کے عروج وزوال کا گواہ بنا، اور اہلِ قلم کے ہاتھوں کبھی محبت کا پیام، کبھی طنز کا نشتر اور کبھی تاریخ کا معتبر حوالہ بن کر محفوظ ہوا۔ آج جب پیغام رسانی لمحوں کا کھیل بن چکی ہے، مکتوب نگاری ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل تاثیر الفاظ کی تیزی میں نہیں بلکہ ان کے اخلاص اور تہذیبی وقار میں پوشیدہ ہے۔

اردو رباعیات

سفیان مظفر ❖

یہ حقیقت ہے کہ رباعی اردو کی مقبول ترین صنف نہیں ہے، اس لیے کہ اردو میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہے وہ کسی اور صنف سخن کے نصیب میں نہ آسکی، اردو شاعری میں غزل کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم کے اندر دل کو حاصل ہے، اس کے باوجود رباعی کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، رباعی مختصر صنف سخن ہونے کی وجہ سے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ چار مصرعوں یا چار سطروں والی شاعری اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے اور ہر جگہ قبولیت کی نظر سے دیکھی گئی ہے۔ سنسکرت میں رباعی سے ملتی جلتی چیز "چار چرن" موجود ہے، ہندی میں رباعی کے مماثل صنف کو ''چوپالی'' کہتے ہیں، پشتو میں ''چار بیتیہ'' ہے، انگریزی میں اس صنف کو کواٹرین (Quatrain) کہتے ہیں، عربی میں تو رباعی اپنی اصلی صورت میں موجود ہے، عربی رباعی کی بحر بھی وہی ہے جو فارسی رباعی کی ہے۔

رباعی دیگر ادب کے اصناف سخن سے ملتی ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ رباعی کا ماخذ انہی زبانوں میں سے کوئی ایک ہے، رباعی عرب کی بھی ایجاد نہیں ہے، بلکہ رباعی اصل میں ایران کی ایجاد ہے؛ چونکہ رباعی کی ایجاد تھوڑا اختلاف ہے، اس لیے اس کی ایجاد پر ہم مختصراً گفتگو کریں گے۔

رباعی کی ایجاد:

شمس الدین محمد بن قیس کی کتاب "المعجم فی معائر اشعار العجم" کے مطابق رباعی کا موجد ''رودکی'' ہے اس لحاظ سے رباعی کی ایجاد کا دور چوتھی صدی ہجری ہوتا ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا "خاندان سامانیہ" کے سر بندھتا ہے۔ تذکرہ دولت شاہ کے مطابق ابودلف عجلی اور ابن الکعب نے امیر یعقوب بن لیث صفار کے عہد میں رباعی کی ایجاد کی۔ اس لحاظ سے رباعی کی ایجاد تیسری صدی ہجری میں ہوئی، اگر یہ بات تسلیم کرلیں تو خاندان سامانیہ کی اولیت ختم ہوجاتی ہے۔

❖ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

مولانا شبلی نعمانی نے بھی رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالی ہے:

"شاعری کے متعلق اس خاندان (صفاریہ خاندان) کا بڑا احسان ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی، یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا بچہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا ؎

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو

اس واقعہ کو مدار بنا کر بہت سے مصنفین و محققین نے رباعی کو محض ایک اتفاقی اور شخصی ایجاد قرار دیا ہے اور سب کا ماخذ المعجم یا تذکرہ دولت شاہ ہے، مگر پروفیسر محمود شیرانی رباعی کی اس اتفاقی اور شخصی ایجاد سے متفق نہیں ہیں، بلکہ ان کا خیال ہے کہ رباعی ایک تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔

رباعی کی ایجاد کے سلسلے میں دو نظریے سامنے آئے، ان دونوں نظریوں میں سے پہلے نظریہ کے بارے میں سلام سندیلوی لکھتے ہیں کہ "ان تمام دلائل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رباعی کی ایجاد شخصی اور اتفاقی نہیں ہے، بلکہ تدریجی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قدیم ایران میں ترانہ ایک صنف سخن کی حیثیت سے رائج تھا، اس کا وجود ایران میں عروج اسلام سے قبل بھی ملتا ہے، اس لیے اس کی شخصی ایجاد کا قصہ بالکل فرضی معلوم ہوتا ہے اور پروفیسر محمود شیرانی کا قول کہ رباعی چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے زیادہ وزنی محسوس ہوتا ہے"۔

رباعی کے فارسی النسل اور عربی النسل ہونے میں بہت اختلاف ہے کہ بعضوں نے اسے عربی النسل اور بعضوں نے فارسی النسل قرار دیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی پہلے گروہ کے حامی ہیں، انہوں نے رباعی کو عربی النسل کہا ہے؛ جبکہ پروفیسر محمود شیرانی اس سے یکسر اختلاف کرتے ہیں اور دلائل کے زور سے ثابت کرتے ہیں کہ رباعی کو عرب کی ایجاد کہنا کسی طرح درست نہیں ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی پر ان کی تنقید اس بنیاد پر ہے کہ علامہ مرحوم ہر اس صنف سخن کو رباعی کہتے ہیں جس میں چار مصرعے ہوں؛ چاہے وہ بحر ہزج کے اخرب و اخرم کے 24 / اوزان میں آتے ہوں یا نہ آتے ہوں اور خود پروفیسر شیرانی رباعی میں ان اوزان کی پابندی کے سختی سے قائل نظر آتے ہیں۔

اگر ہم کسی بھی وزن و بحر میں دو شعروں پر مشتمل کسی بھی مقطوعہ کو رباعی کہتے ہیں تو اس ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں رباعی کا آغاز اولین دور عباسی میں ہو گیا تھا۔ اس دور میں ابونواس اور ابوالعتاہیہ کے علاوہ کئی اور عربی شاعروں کے چار چار مصرعوں پر مشتمل مقطوعے ملتے ہیں؛ البتہ اگر اس صلابت

اور سختی کو ملحوظ رکھیں اور بحر ہزج کے اوزان میں ہی رباعی کو منحصر کر دیں تو پھر اس بحر کی ایجاد ایران میں ہوئی ہے۔

وجہ تسمیہ اور اسماء:

اس صنف میں صرف دو شعر یا چار مصرعے ہوتے ہیں؛ اس لیے اس صنف شعر کو دوبیتیہ یا رباعی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (جدید اردو شاعری از عبدالقادر سروری صفحہ 49)

رباعی کے مختلف نام ہیں، تفصیل سے قطع نظر صرف نام درج کیے دیتا ہوں:

(۱) ترانہ (۲) چہار بیتی (۳) دوبیتی (۴) خصی (۵) مصراعی (۶) جفتی

رباعی کا استعمال:

رباعی کی ابتدائی تاریخ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف صرف عورتوں اور بچوں تک ہی محدود تھی، مگر جب رباعی نے آہستہ آہستہ مقبولیت حاصل کی تو صوفیائے کرام بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور چونکہ رباعی کی بحر کو موسیقیت سے ایک خاص لگاؤ ہے؛ اس لیے اس کو محفل سماع میں بھی جگہ ملی، صوفیاء کی محفل کے علاوہ رباعی نے درباروں میں بھی اپنا سکہ جمایا، مولانا شبلی نے شعرالعجم کے حصہ اول میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ محمود غزنوی شراب پی کر بدمست ہوگیا، عالم مستی میں اس کی نظر ایاز پر پڑی، اس کی زلفیں شکن در شکن چہرے پر بکھر کر محمود کے دل پر بجلیاں گرا رہی تھیں، اس نے بے اختیار ایاز کی گردن میں بانہیں ڈال دیں، مگر فوراً ہی سنبھل گیا اور ایاز کی زلفوں کے کترنے کا حکم دیا، صبح کو جب ایاز کو بغیر زلفوں کے دیکھا تو سخت مغموم ہوا ایسے موقع پر عنصری نے حسب ذیل رباعی کہی:

گر غیب سر زلف بت از کاستن است
نہ جائے بہ غم نشستن جاستن است
وقت طرب و نشاط مئے خواستن است
کاراستن سرو زپیراستن است

اس رباعی سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور عنصری کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

فارسی رباعی کا اردو رباعی پر اثر:

اردو رباعی پر کچھ لکھنے سے پہلے فارسی رباعی کی وہ خصوصیات جو اردو رباعی میں موجود ہیں ان کو واضح کرنا ضروری ہے، فارسی رباعی کی ترقی میں صوفیائے کرام کا بڑا کردار ہے، اسی لیے اس صنف

میں سنجیدہ خیالات مثلاً فلسفہ، تصوف، مذہب، اخلاق اور عشق وغیرہ کے مضامین شامل ہو گئے ہیں، اردو رباعی فارسی رباعی سے آئی ہے، اس لیے یہ سارے مضامین اردو میں بھی در آئے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اردو رباعی فارسی رباعی کا مکمل چربہ ہے، اردو رباعی کا ماخذ فارسی رباعی ضرور ہے، مگر اس نے ہندوستان کی فضا میں سانس لی ہے، لہذا ہندوستانی اثرات سے محفوظ رہنا اس کے لیے ممکن نہ تھا، اردو رباعی ہندوستان کے ہر دور کی خصوصیات، تغیرات اور انقلابات کی سچی تصویر رہی ہے، چنانچہ میر انیس حالی اکبر اور جوش کی رباعیاں اپنے دور کے سماجی معاشرتی اور سیاسی حالات کی آئینہ دار ہیں۔

اردو کا پہلا رباعی گو شاعر:

اردو کے پہلے رباعی گو شاعر کی تعین دشوار ہے، البتہ قلی قطب شاہی دور کے دو شعراء محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کی رباعیاں دستیاب ہوئی ہیں، لیکن ان سے پہلے فیروز، محمود اور ملا خیالی بھی مشہور اور مستند شاعر گزرے ہیں، ان شاعروں کا کلام محفوظ نہ رہ سکا جس کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ انہوں نے رباعیاں کہی ہیں یا نہیں۔ ان کے کلام کی عدم موجودگی میں رباعی کے میدان میں صرف محمد قلی قطب شاہ اور وجہی رہ جاتے ہیں، اب دونوں میں سے پہلا رباعی گو شاعر کون ہے اس کی تعیین مشکل ہو جاتی ہے، البتہ سلام سندیلوی نے وجہی کے مقابلے میں محمد قلی قطب شاہ کو پہلا رباعی گو شاعر کہا ہے۔

شمالی ہند میں رباعی کی ابتدا:

جب 1733 عیسوی میں ولی دکنی کا مکمل دیوان دلی پہنچا تو دلی میں اردو شاعری کے چرچے نے زور پکڑا۔ فائز، حاتم، آبرو، مضمون اور یکرنگ وغیرہ نے ولی کے دیوان سے متاثر ہو کر اردو میں شاعری کرنا شروع کیا، مگر رباعی حاتم کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ ڈاکٹر زور نے "سرگزشت حاتم" میں حاتم کو دہلی کا پہلا اردو شاعر بھی تسلیم کیا ہے اور ان کی دو رباعیات درج کی ہیں، ایک رباعی بطور نمونہ ہم بھی لکھتے ہیں:

یک ذرہ کبھو نہ کام آئی مجھ کو
دولت مندوں کی آشنائی مجھ کو

گو فائدہ ان سے ہو نہ ہو حاتم
یکسا ہے شاہی و گدائی مجھ کو

اس طرح حاتم کی رباعیات کو شمالی ہند میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

رباعی کی نشو ونما:

دور متقدمین (خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا محمد رفیع سودا، میر حسن، میر تقی میر اور قائم چاند پوری وغیرہ کا زمانہ) میں تمام اصناف سخن نقطۂ عروج پر پہنچ گئے، اس دور میں جہاں قصیدہ، مثنوی اور غزل کی طرف شعرا نے بھرپور توجہ دی وہیں رباعی پر بھی طبع آزمائی کی، اس دور کی رباعیات میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو فارسی رباعی میں ملتی ہیں، لیکن فارسی رباعی کے مقابلے میں اردو رباعی میں ایک موضوع کا اس دور میں اضافہ ہوا ہے، اس دور میں رثائی رباعیاں بھی کہی گئی ہیں جن میں شہیدان کربلا کا ذکر ہے۔

رباعی گو شعراء:

اس ذیل میں ہم کچھ اردو رباعی گو شعرا کا ذکر کریں گے جس سے اردو میں اس صنف کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

خواجہ میر درد: (1721 سے 1785)

دور متقدمین کے مشہور و معروف شعراء میں سے ہیں، میر درد اگر چہ صرف غزل کے شاعر ہیں جو سلاست، روانی اور تصوف کی چاشنی کی وجہ سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں، تاہم ان کی رباعیات بھی حسن و خوبی اور جاذبیت و دلکشی میں کم نہیں، میر نے "نکات الشعراء" میں درد کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، مگر زیادہ تر رباعیات کہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درد کو فارسی رباعیات کے کہنے میں ید طولہ حاصل تھا، شاید اسی وجہ سے اردو رباعیات میں بھی بہت کامیاب نظر آتے ہیں، ان کی رباعی گوئی کا اعتراف نواب سید امداد امام اثر نے " کاشف الحقائق" میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو رباعی نگاری کا مذاق حاصل تھا"

یہ جملہ خواجہ میر درد کے لیے سند کا حکم رکھتا ہے، کیونکہ نواب صاحب نے سودا، میر، ذوق، غالب

اور مومن کی تعریف نہیں کی ہے، بلکہ ان کی رباعیات کے معیار کو پست قرار دیا ہے۔ خواجہ صاحب کی رباعیات میں عارفانہ و متصوفانہ، فلسفیانہ، عشقیہ اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین ملتے ہیں۔

نمونہ کلام:

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں
ہر حرف میں کتنے ہی ورق پڑھتا ہوں
اس علم کی انتہا سمجھنا آگے
اے درد ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

میر سوز: (1798-1721)

میر سوز بھی اس دور کے نامور شعرا میں سے ہیں، ان کے کلام کے بارے میں مرزا علی لطف نے "تذکرہ گلشن ہند" میں لکھا ہے:

" کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز وساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز ہے"

سوز نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، ان کے دیوان میں رباعیات بھی موجود ہیں جو متنوع مضامین پر مشتمل ہیں، چونکہ سوز غزل کے شاعر تھے اور ان کی غزلیں بلند پایہ ہیں، اس لیے ان کی عشقیہ رباعیات میں بھی اعلی جذبات پائے جاتے ہیں، ان کی رباعیات میں تاثیر اور تڑپ ہے، اگر چہ سوز نے عشقیہ رباعیات کے علاوہ اخلاقی رباعیات، فلسفیانہ رباعیات اور مذہبی رباعیات بھی لکھی ہیں، مگر غزل کا شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی عشقیہ رباعیات بہت اعلی ہیں۔

نمونہ کلام:

بس سوز سنبھل یہ آہ و زاری کب تک
بس ہاتھ نہ مل، یہ بے قراری کب تک
آپ ہی عاشق ہے تو اور آپ ہی معشوق
پردے سے نکل یہ شرم ساری کب تک

مرزا محمد رفیع سودا (1706/ 1708-1781)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں، سودا کی برتری اور عظمت کا راز اس امر میں پنہاں ہے کہ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے وہ شہنشاہ قصیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ غزلیات اور مراثی کے بھی باعث فخر شاعر ہیں، ان اصناف سخن کے علاوہ سودا

نے رباعیات بھی کہی ہیں۔سودا کی کلیات میں کل 80 / رباعیاں درج ہیں،ان کی رباعی کے عام موضوعات فارسی رباعیوں کے موضوعات سے قریب تر ہیں،ان کی رباعیات میں بھی مدح،منقبت، اخلاق،عشق ومحبت،معرفت وتصوف،تعلّی اور ہجو کے مضامین ملتے ہیں،کچھ رباعیات شخصی وسوانحی بھی ہیں۔

نمونۂ کلام:

سودا شعر میں ہے بڑائی تجھ کو
تشریف سخن عرش سے آئی تجھ کو
عالم تجھے اس فن میں پیمبر سمجھا
پوجا جہلا نے بخدائی تجھ کو

میر تقی میر (1722سے1810)

میر تقی میر دورِقدیم کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں،غزل میں جوسوز وگداز اور درد وداغ کی کیفیت میر نے پیدا کی ہے وہ کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ کرسکا،یہی حال ان کی رباعیات کا بھی ہے، ان کی رباعیات میں بھی بلا کی تپش اور تڑپ پائی جاتی ہے،مگر افسوس یہ ہے کہ میر کی غزل کی تپش کو ہر شخص نے محسوس کیا،لیکن ان کی رباعیات سے ہر وقت جوآنچ نکلتی رہتی ہے اس پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔

میر عشق پیشہ شاعر ہیں،ان کی غزل کو جادو اور جاذبیت اس عشق ہی نے دیا اور ان کی رباعیات میں بھی عشق ہی کی آگ روشن ہے،میر کی المیہ اور حزنیہ رباعیات اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر چکی ہیں،اس کے علاوہ میر کی وہ رباعیاں زبردست افادیت کی حامل ہیں جن میں اس دور کا پرآشوب ماحول اور اس عہد کی مسموم فضا کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اس لحاظ سے میر شاعر بھی ہیں اور مؤرخ بھی۔

نمونۂ کلام:

اے میر کہاں یہ دل لگایا تو نے
شکل اپنی بگاڑ کر کڑھایا تو نے
جی میں نہ تیرے حال نہ منہ پر کچھ رنگ
اپنا یہ حال کیا بنایا تو نے

دورِ متقدمین کے چند شعراء کو ہم نے بطور نمونہ پیش کیا ہے، اب ہم دور متوسطین ومتاخرین کا مختصر ذکر کریں گے۔

دور متوسطین :

ادب کی تاریخ میں کسی بھی دور کو حتمی طور پر متعین کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ وہ شعراء جن کا ہم بعد کے دور میں ذکر کرتے ہیں وہ پہلے دور میں بھی موجود ہوتے ہیں، مگر اس دور میں ان کے نوآموز و نومشق ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کرتے ہیں، یہی پریشانی یہاں بھی پیش آئی ہے، اس لیے ان کو الگ زمرہ میں رکھ کر اختصار کے ساتھ گزارا جارہا ہے کہ مفصل گفتگو کا یہ مختصر مقالہ حامل نہیں۔

یہ دور پچھلے دور سے کچھ مختلف ہے اس دور میں بہت سے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہوگئیں اور زبان زیادہ صاف ستھری اور شستہ ہوگئی، خاص طور سے انشاء نے نئے الفاظ اور نئی تراکیب سے اردو زبان کے دائرے کو وسیع کیا، اس دور میں شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی، قدیم دور میں بادشاہ شعراء کی سرپرستی کرتے، شعراء ان کی سرپرستی میں شاعری کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیتے تھے، اس کے صلے میں انعام واکرام پاتے تھے، گویا ان کا اصل مقصد ادب کی خدمت اور ترقی تھی، مگر اس دور میں شعراء کا اصل مقصد رؤساء وامراء کو خوش کرنا ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ رام بابو سکھ سینا نے " تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "اس دور کے شعراء نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو "اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شعر وادب کا معیار پست ہوگیا، ساتھ ہی شعرا میں رقابت کا جذبہ بیدار ہوگیا اور آپس میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔

یہ دور دو مقام کا مرقع ہے دہلی اور لکھنو، دہلی میں ذوق غالب اور مومن نے دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ رباعیات بھی کہی اور کسی طرح اس صنف سخن کو گرنے نہ دیا۔ جب دلی اجڑی تو زبان وادب کا بازار لکھنؤ منتقل ہوگیا۔

غالب کی ایک رباعی بطور نمونہ ہم پیش کرتے ہیں:

دکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کے شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

لکھنؤ:

لکھنو اسکول کے نمائندہ شاعر آتش و ناسخ ہیں، ان کے علاوہ منیر شکوہ آبادی، رند لکھنوی، صبا لکھنوی، نواب واجد علی شاہ اختر، اسیر لکھنوی، آفتاب الدولہ قلق لکھنوی، لکھنؤ اسکول کے نامور شعرا ہیں۔ دور متوسط میں میر انیس و دبیر کا شمار اردو کے بڑے رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے، انہوں نے کافی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں، ان کے یہاں وہ تمام موضوعات پائے جاتے ہیں جو رباعی کے جزو لاینفک ہیں، انیس کی ایک رباعی بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

سایہ سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

دور متاخرین:

سلطنت اودھ کے زوال کے بعد لکھنؤ ادبی حیثیت سے اجڑ گیا، یہاں کی رنگین اور غمگین دونوں قسم کی محفلیں ویران ہو گئیں، شعراء دوسری ریاستوں میں منتقل ہونے لگے حیدرآباد، فیض آباد، عظیم آباد، اور رام پور کی طرف چلے گئے، اس دور کے شعراء میں امیر مینائی، داغ دہلوی، تسلیم لکھنوی، آسی غازی پوری وغیرہ بہت نمایاں شاعر تھے۔

امیر مینائی کی ایک رباعی بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

غائب بہت اے جان جہاں رہتے ہو
مانند نظر ہم سے کہاں رہتے ہو
ہر چند کہ آنکھوں میں ہو تم دل میں ہو
معلوم نہیں پر کہ کہاں رہتے ہو

اختتامیہ:

ہم نے یہیں پر اپنی بات کو روک دی ہے اگر چہ جتنا لکھا ہے اس سے کہیں زیادہ لکھنا باقی ہے کہ رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں تمام ہی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے، رباعی کے فن میں عروض کی ایجاد اور

اہمیت، رباعی کے اوزان کی خصوصیات، رباعی گوشاعر کے لیے عروضی پابندیاں اور آزادیاں، اردو رباعی کے موضوعات، اردو رباعیات کی وسعت اور مستقبل ایسے عنوانات ہیں جو مستقل ایک باب کا تقاضہ کرتی ہیں، مگر اس قدر تفصیل کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی موقع، اس لیے ہم یہی اپنی بات سے قلم انداز کرتے ہیں۔

ماٰخذ:

اردو رباعیات: از عبدالسلام سندیلوی

خیام: از سلیمان ندوی

شعرالعجم: از شبلی نعمانی

فکر وفن کا عہد

رئیس احمد جعفری ندویؒ

جواد احمد رستم ❖

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے آپ کی وفات پر بعنوان "قطبِ وقت" ایک تعزیت نامہ تحریر فرمایا، جس کے ابتدائی کلمات یوں ہیں: ''موصوف میں خوبیاں بے شمار تھیں، میں ذکر صرف ایک خوبی کا کروں گا، اور وہ خوبی ہے ان کا خلوص واخلاص۔ یہ ام الصفات ہے، اور سو خوبیوں کی ایک خوبی ہے۔''

اسی صفت نے حضرت کو عوام وخواص میں یکساں مقبولیت عطا کی۔

ولادت اور جائے ولادت:

آپ کی پیدائش ۲۳/ مارچ ۱۹۱۴ء (بعض روایات کے مطابق ۱۹۰۷ء یا ۱۹۱۳ء) کو سرزمینِ اودھ کے ضلع لکھیم پور کھیری میں ہوئی، جہاں آپ کے والد گرامی ملازمت کرتے تھے، جب کہ پرورش خیر آباد، ضلع سیتاپور میں ہوئی۔ آپ کا نام رئیس احمد تجویز ہوا۔ آپ کا تعلق ساداتِ جعفری نیشاپوری خاندان سے تھا، جو نیشاپوری تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ خاندان کے بزرگ مختلف ادوارِ حکومت میں امبالہ، جونپور، رائے بریلی وغیرہ میں مناصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ عہدِ شاہ جہانی میں شاہی حکم کے تحت ابوالفتح المعروف بہ فتّن سیتاپور تشریف لائے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آج بھی محلّہ فتّن سرائے انہیں کی نسبت سے موسوم ہے۔

والد صاحب کا انتقال اور گھریلو معاملات:

جعفری صاحب کی عمر محض چار یا پانچ برس کی تھی کہ آپ کے والد سید نیاز احمد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری مرحوم بھی کمسن تھے۔ جائیداد خاصی تھی مگر نگران کوئی نہ تھا۔

❖ متعلم شعبۂ عیسائیت دارالعلوم دیوبند

اس ضمن میں بعض خاندانی ناچاقیاں بھی ہوئیں، یہاں تک کہ آپ کی والدہ کو عدالت کا رخ کرنا پڑا۔
جعفری صاحب خود بیان کرتے ہیں:

"ابا کے انتقال کے بعد بڑے بابا (حضرت ریاض احمد ریاض خیرآبادی، جو امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے، اور میرے نانا سید نیاز احمد خیرآبادی کے بڑے بھائی تھے) روزانہ خیرآباد سے سیتاپور آتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔ شام قیامت بن کر آتی تھی۔ اتنا بڑا گھر اور رہنے والی صرف عورتیں: نانی، والدہ اور ایک باندی؛ دو چھوٹے چھوٹے لڑکے یعنی میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد، میں اور ایک گھریلو ملازم۔ رات کو دادا سید قائم علی آجایا کرتے تھے۔"

کچھ دنوں بعد آپ کے نانا سید نیاز احمد اور ان کے چھوٹے بھائی سید فیاض احمد (جو اُس وقت گولا، کھیری میں پولیس انسپکٹر تھے) تشریف لائے اور آپ کو بمعہ والدہ و بڑے بھائی میرٹھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن والدہ اور نانی آمادہ نہ ہوئیں۔ چونکہ گھریلو نظم و نسق کے لیے کوئی ذمہ دار نہ تھا، اس لیے باقاعدہ مختار صاحب بسواں کو معقول تنخواہ پر ناظرِ عام مقرر کیا گیا اور قاضی حبیب اشرف صاحب نگران مقرر ہوئے، کہ ان کی مرضی اور مشورے کے بغیر کوئی کام نہ ہوگا۔

سیتاپور سے بھوپال:

کچھ عرصے بعد آپ مع والدہ اور بھائی کے بھوپال نانا نیاز احمد صاحب کے پاس چلے گئے، لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی، لہٰذا دوبارہ سیتاپور واپس آئے اور پھر ریاض احمد صاحب کے پاس خیرآباد میں مقیم ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم:

والد کے انتقال کے بعد والدہ نے تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ بڑے بھائی اسکول میں داخل کر دیے گئے اور جعفری صاحب کے لیے حافظ جی مقرر کیے گئے جو گھر آ کر قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ بھوپال میں بھی حافظ جی کا انتظام کیا گیا۔ واپسی پر مناسب معلم نہ ملا تو آپ کو لکھنؤ فرقانیہ بھیج دیا گیا۔

جائیداد کی ناقص دیکھ بھال کے باعث آپ اور آپ کے بڑے بھائی کی تعلیم پر اثر پڑا۔ چنانچہ سید عقیل احمد صاحب آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔ تاہم رئیس احمد جعفری صاحب نے اپنی

تعلیم جاری رکھی۔قرآن مجید مختلف اساتذہ سے پڑھا۔فرقانیہ جانا بڑے بھائی کو گوارا نہ ہوا، کمسنی کے سبب چھوٹے بھائی کی جدائی برداشت نہ کر سکے اور آپ کو بلا لیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستگی:

والدہ آپ کی تعلیم کے لیے فکرمند رہیں، چنانچہ ریاض احمد صاحب کے مشورے سے آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا گیا، جہاں آپ غالباً 1923ء یا 1924ء میں داخل ہوئے اور 1930ء تک وابستہ رہے۔

ندوہ میں آپ نے جو علمی و ادبی کارنامے انجام دیے، وہ ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ کی پرورش علمی، ادبی اور شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ریاض احمد خیرآبادی، جن کی سرپرستی میں آپ رہے، امیر مینائی کے ممتاز شاگرد تھے۔حضرت وسیم بھی آپ کے قریبی عزیز تھے، مضطر خیرآبادی بھی دور نہ تھے، اور آپ کی والدہ بھی شاعرہ تھیں۔شعر و ادب کی فضا میں آپ نے آنکھیں کھولیں اور ندوہ کی علمی و ادبی صحبتوں نے اس ذوق کو جلا بخشی۔

ندوہ میں ابھی دوسرا سال تھا کہ آپ نے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنا شروع کر دیے۔طلبہ میں خاصی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔مختلف رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہونے لگے۔ اس وقت ندوہ میں ''الاصلاح'' کے نام سے ایک انجمن ہوا کرتی تھی، جس کا مقصد طلبہ کی تحریری صلاحیتوں کو مہمیز دینا تھا۔آپ ''انجمن الاصلاح'' کے دفتر پابندی سے جاتے اور متعدد رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتے، زیادہ سے زیادہ وقت مطالعہ میں گزار دیتے 1924ء میں انجمن کے رکن منتخب ہوئے اور ایک دستی قلمی رسالہ شائع کیا 1929ء میں نائب ناظم اور پھر 1930ء میں ناظم اعلیٰ قرار پائے آپ کے دور نظامت میں انجمن نے بہت ترقی کی اپنی قابلیت اور محنت کی وجہ سے اساتذہ کے چہیتے اور منظورِ نظر تھے خصوصاً شیخ الحدیث علامہ حیدر حسن خاںؒ (1942ء) ٹونکی ''خلیفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ مہاجر مکی) انھیں بہت چاہتے تھے، آپ نے تمام کتب حدیث حضرت حیدر حسن خاںؒ سے ہی پڑھی تعلیمی اوقات کے علاوہ بھی آپ حضرت سے استفادہ کرتے تھے قیام ندوہ کے زمانے میں جن اساتذہ سے پڑھا ان میں مولانا حفیظ اللہ (شاگرد رشید علامہ عبدالحی فرنگی محلی) مولانا عبدالحکیم صدیقی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مولانا عبدالودود جیراج پوری مولانا سید علی زینبی اور علامہ شبلی نعمانی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں علاوہ دیگر اساطین علوم فنون سے بھی وابستہ رہے، صرف ونحو مولانا کلیم اللہ

صاحب بہرائچی اور مولانا محمد سلیم صاحب کشوری سے پڑھا۔ بقول حضرت مولانا عبدالسلام قدوائیؒ:

''خلافت و کانگریس کی تحریکوں کو دیکھنے ان کے رہنماؤں کے ساتھ وقت بتانے اور ان کے خیالات سننے اور بڑھنے کا موقع ندوہ ہی کے دور طالبِ علمی سے مل گیا تھا، اتحاد واتفاق کی روح پرور جھلک بھی دیکھنے کو مل گئی تھی اور انتشار واختلاف کا دور بھی، ان مشاہدات کی وجہ سے سطح کے نیچے کی سیاسی کیفیت سے کچھ آ گاہی ہوگئی تھی، مولانا آزاد کے الہلال اور ہمدرد کے مضامین مطالعے میں رہے، نصب خلافت کا نظریہ ذہن ودماغ میں جا گزیں ہوگیا۔''

ندوہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی:

مولانا مرحوم ان کے چند ہمنواء جن میں بطور خاص مولانا محبّ اللہ لاری، مولانا نوراللہ مونگیری، مولانا عبدالمجیب سہالوی، مولانا نجم الدین قدوائی، مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، حامد لکھنوی، اکبر بلاسپوری، مولانا عبدالمجید اعظمی وغیرھم نے مولانا آزاد کی طرز پر ایک جماعت بنانے کا ارادہ کیا۔ 1930ء میں یہ خیال ان لوگوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں پیش کیا، مولانا موصوف نے چند مفید مشوروں کے ساتھ مختصر پیمانے پر آغاز کی تدبیر بتلائی، لیکن ایک معمولی واقعہ کی وجہ سے ندوہ میں ایک زبردست اسٹرائک کا ماحول ہوگیا، کچھ احباب تو تعلیم مکمل کر کے جا چکے تھے باقی جو لوگ رہ گئے تھے جن میں خود جعفری صاحب سرفہرست ہیں اس قضیے کی زد میں آگئے اور ارباب حل وعقد نے نظام پر قابو پانے کے لئے بشمول آپ کے تمام کا ندوہ سے نام خارج کردیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زمانۂ قیام میں مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی کی شفقت اور جانفشانی نیز مولانا حیدر حسن خاںؒ صاحب کی علمی قابلیت اور خلوص وسادگی سے بے حد متاثر ہوئے، مولانا حیدر حسن خاںؒ صاحب جعفری صاحب کے ساتھ خصوصی شفقت اور گہرا تعلق رکھتے تھے حدیث کی تمام تر تعلیم انھیں کی رہین منت ہے بعد کو ارادت کا تعلق بھی قائم کرلیا تھا۔

ندوہ سے علیحدہ ہونے کے بعد جعفری صاحب نے جامعہ ملیہ میں داخلے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس زمانے میں شیخ الجامعہ تھے ان کی خدمت میں درخواست بھیجی گئی، علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے سفارشی خط لکھا جس پر آپ اور مولانا عبدالسلام قدوائیؒ وغیرہ جامعہ کے طالب علم بن گئے۔ جعفری صاحب چونکہ قلبی اور ذہنی طور سے ندہ سے وابستہ تھے اس لئے عرصے

تک جامعہ میں جی نہیں لگا، بقول مولانا عبدالسلام قدوائیؒ:

''جب بھی احباب کی کوئی محفل لگتی تو رئیس بے ساختہ کہتے "ہم کو تو وہ اپنا رنگ محفل یاد آتا ہے''

جعفری صاحب اسی دوران ملیریا کا شکار ہو گئے شدید بیماری کی وجہ سے گھبرائے اور گھر چلے گئے مولانا عبدالعلیم صاحب کی توجہ سے اللہ نے صحت عطاء فرمائی اور پھر آپ دہلی جامعہ تشریف لے آئے اور تقریباً چار سال تک جامعہ سے فیضیاب ہوتے رہے۔

جامعہ کی زندگی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب، پروفیسر کیلاٹ صاحب اور مولانا اسلم صاحب سے خاص طور پر متأثر ہوئے۔ فارسی آپ نے مولانا اسلم صاحب سے ہی پڑھی۔

ایک خواب اور سیرت محمد علی کی تصنیف:

جامعہ آنے سے پہلے جعفری صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا کہ کسی اچھی جگہ بیٹھے ہیں اور سامنے نہرو رپورٹ جیسی کوئی کتاب رکھی ہے، اس زینہ نما جیسی جگہ میں قدم رکھا اور باہر ایک وسیع دنیا میں پہونچ گئے۔ یہ خواب جعفری صاحب کے لیے عین حقیقت بن گیا، واقعی جامعہ کے ذریعے انھیں شہرت وعزت کا وسیع میدان ملا، نہرو رپورٹ جیسی کتاب "سیرت محمد علی" سے تعبیر دی جاسکتی ہے جو ان کی آیندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مرحوم حامد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ کے دل میں سیرت محمد علی لکھوانے کا خیال آیا اور شفیق الرحمان قدوائی صاحب مرحوم نے رئیس صاحب کی جانب اشارہ کیا۔ اور کام شروع ہو گیا، رئیس صاحب کی یہ پہلی تصنیف تھی ظاہر ہے کہ ایک طالب علم جس نے مولانا محمد علی جوہر کو دور سے دیکھا اور اخبار میں پڑھا ہو علم وتحقیق کا شاہ کار تیار نہیں کرسکتا تھا مگر پھر بھی مولانا محمد علی کی زندگی کے تمام تر پہلو اس کتاب میں آگئے اور آج تک کسی کو مولانا محمد علی کی اس سے بہتر سوانح حیات لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں آپ کی مقبولیت:

جعفری صاحب نے جامعہ میں چار برس گزارے اساتذہ اور کارکنان کے نہایت منظور نظر رہے، مخلص دوستوں کا بھی ایک شاندار حلقہ میسر ہوا، ملا اسماعیل محمد، برکت علی فراق، محمد طیب، محمد حسین اور مولانا عبدالسلام قدوائیؒ وغیرہم بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ علم ونظر کی نئی راہیں جامعہ ہی کی بدولت نظر آئیں، یہیں کی ہمت افزائیوں نے ایک طائر پر شکستہ کو نئے بال و پر عطا کیے اور آسماں

پیمائیوں کا حوصلہ بخشا۔ جامعہ میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں آنے کے دوسرے سال ہی جعفری صاحب کالج کی انجمن "اتحاد" کے صدر منتخب ہوئے اور آپ کا دور کافی کامیاب رہا، آپ کا پرزور خطبہ صدارت اور اس سے زیادہ مدلل سالانہ رپورٹ کا بہت دن چرچا رہا کرتا تھا۔

دہلی سے ممبئ اور ''خلافت'' کی ادارت:

جامعہ کی چہار دیواری سے باہر آپ کی علمی شہرت "سیرت محمد علی" کے ذریعے پہونچی حتی کہ مولانا محمد علی کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے آپ کو اخبار "خلافت" کی ادارت کے لیے باصرار ممبئ بلایا اور خلافت کا مدیر منتخب کر دیا، ادھر مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے تھی کہ ابھی جامعہ میں کچھ عرصے اور رہ کر مزید صلاحیت پیدا کریں مگر خانگی پریشانیوں نے ملازمت پر مجبور کیا اور وہ دہلی سے بمبئ چلے گئے اور خلافت کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ جعفری صاحب کے لیے اخبار نویسی کا یہ پہلا تجربہ تھا، خلافت کا معیار، مقصد اور اسکی اہمیت بتانے کی کوئی حاجت نہیں ہر صاحب ذوق الہلال اور خلافت کے متعلق معلومات رکھتا ہے، ایسے مقبول اور معیاری کام کو آپ نے نہایت قابلیت اور سلیقے سے نبھایا۔

جعفری صاحب نے کبھی بھی اپنی خودداری اور آزادی کا سودا نہیں کیا، خلافت کی ادارت کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ غازی محی الدین اجمیری جو خلافت کے ورکنگ سکریٹری تھے اور ادارتی عملے کے بھی نگراں تھے جعفری صاحب کے پاس بیٹھ کر ان کی ترجمہ کردہ ایک خبر کو دیکھنے لگے جس میں تین سرخیاں تھیں۔ غازی صاحب نے ایک سرخی یہ کہتے ہوئے کاٹ دی کہ اس میں دو ہی ہونا چاہیئے، جعفری صاحب نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک سرخی اور بڑھا دی، پھر فرمایا: غازی صاحب اب چار سرخیاں ہونگی ترجمہ میں نے کیا ہے سرخیاں میں ہی دونگا جب آپ ترجمہ کرنا تو ایک سرخی رکھنا۔ یہ جواب غازی صاحب کو بہت برا لگا وہ فوراً مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کے پاس گئے اور یہ کہتے ہوئے کہ دیکھو رئیس کا میرے ساتھ کیا برتاؤ ہے، ہم رئیس کو دیکھ لیں گے وغیرہ ناراضگی کا اظہار کیا۔ عبدالسلام صاحب فوراً دوڑتے ہوئے جعفری صاحب کے پاس پہونچے اور قلتِ روزگار کا حوالہ دیکر اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ اس طرزِ عمل سے نہ صرف باز آئیں بلکہ غازی صاحب سے معافی بھی مانگ لیں ورنہ ملازمت سے تو رہے، جعفری صاحب نے برجستہ فرمایا: "عبدالسلام سن!

جب تک رہیں گے عزت کے ساتھ رہیں گے، رزق غازی کے ہاتھ میں نہیں رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ہندوستان سے کراچی طرف ہجرت:

مولانا شوکت علی صاحب کے انتقال کے بعد خلافت سے الگ ہوکر جعفری صاحب نے اپنا ایک اخبار نکالا، وہ ذہنی طور پر مولانا محمد علی جوہر سے بہت متاثر تھے، مولانا شوکت علی کی صحبت میں یہ اثر اور بڑھا۔ نہرو رپورٹ کے بعد ہی سے وہ کانگریس سے نہایت بدظن ہو گئے اس بدظنی میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور بڑی بے باکی کے ساتھ وہ اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد حالات نے ان کی تلخی میں اور اضافہ کیا اور انھیں مجبوراً پاکستان جانا پڑا، پاکستان میں ان کے قدردان موجود تھے، کچھ عرصے تک " ریاض " کے نام سے اپنا اخبار نکالا، ایک ماہنامہ بھی عرصے تک نکالتے رہے، پھر " ثقافت لاہور " کے حلقہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ پاکستان میں تقریباً بیس سال انھوں نے گزارے اور بے شمار مضامین ومقالات کے علاوہ تراجم وتصانیف کی سیکڑوں جلدیں لکھ ڈالیں۔

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام:

جعفری صاحب اپنے ایک مضمون " میں 14 اگست کی رات کہاں تھا" میں اپنا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

" ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے مجھے ایک نوٹس ملا جس کی رو سے پریس کمیٹی میں اصالتاً مجھے حاضر ہونا چاہیئے تھا، جہاں میرا کیس پیش ہو رہا تھا۔ پریس کمیٹی کے صدر از روئے منصب مسٹر مرار جی دیسائی ہوم منسٹر بمبئی تھے۔ اور از روئے تعامل یہ منصب سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل کو حاصل تھا، ممبروں میں " سر فرانسس لو" ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا اور ایک گجراتی اخبار کا ہندو ایڈیٹر شامل تھا۔ میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا، سر فرانسس لو، بریلوی صاحب اور متعدد ممبر آ چکے تھے۔ سر فرانسس نے کرسی صدارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بریلوی صاحب سے کہا: کارروائی شروع ہو جانی چاہیئے۔ بریلوی صاحب مسکرائے اور کرسی صدارت پر متمکن ہونے ہی والے تھے کہ دفعتہً دروازہ کھلا۔ اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا۔

مرار جی دیسائی باہر نکلے اور آتے ہی کرسی صدارت پر متمکن ہو گئے، بیچارے بریلوی صاحب منہ دیکھتے رہ گئے۔ میرا مقدمہ پیش ہوا، مرار جی نے مجھ سے سوال کیا:

آپ کارروائی انگریزی میں چاہتے ہیں؟

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے عرض کیا: انگریزی نہ آپ کی زبان ہے نہ میری، گجراتی صرف آپ کی زبان ہے اردو ہم دونوں کی زبان ہے لہذا وہ بہتر رہے گی۔

مرار جی کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا، لیکن خاموش بیٹھے رہے۔ کارروائی اردو میں شروع ہوئی میرے تین مقالاتِ ادارت حاضرین کو سنائے جانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد مرار جی کا پیمانۂ صبر چھلکا اور مداخلت کرتے ہوئے سوال کیا؟ آپ اب تک پاکستان کیوں نہیں گئے؟

میں نے سوال کیا: کیوں جاؤں؟

فرمایا: وہ آپ کا وطن ہے!

میں نے عرض کیا: میرا وطن وہ ہے جہاں میں موجود ہوں!

غصے سے کہنے لگے: کیا آپ قیام پاکستان کے پرزور نقیب نہیں تھے؟ کیا آپ نے اپنا قلم تائید پاکستان کے لیے نہیں اٹھایا؟

ہاں! میں نے یہ کیا تھا لیکن ترکوں کی آزادی کے لیے بھی یہی کیا تھا مگر انگریزوں نے کبھی نہیں کہا، قسطنطنیہ چلے جاؤ۔ مصر کے لیے بھی کیا تھا، مگر انگریزوں نے کبھی شاہراہ بغداد کی جانب اشارہ نہیں کیا، ایران کے لیے بھی کیا تھا مگر انگریزوں نے نہ ہم سے اظہار وفاداری کا مطالبہ کیا اور نہ ہی طاعت کی بیعت لی، نہ نکال کر تہران بھیجا۔ آپ کیوں میرا وطن مجھ سے چھڑانا چاہتے ہیں؟

مرار جی نے حاکمانہ دبدبے کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: آپ کا وطن پاکستان ہی ہے، آپ کو چلے جانا چاہیے، آپ کو جانا پڑے گا یا۔ یہ فرمایا اور برہمی کے عالم میں اٹھ کر چلے گئے، میں دل ہی دل میں کہتا رہ گیا!

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظامؔ
ایسے ہیں ہم، کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہوا

اور بالآخر جنوری 1948ء میں اُن سطروں کو لکھنے والا پاکستان آ گیا اور آنے کے بعد یہ حالت ہے کہ:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

جعفری صاحب کی تصانیف:

علم وادب، افسانہ وقصص، تاریخ وسیاست، معیشت ومعاشرت اور مذہب وثقافت کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جس میں ان کی کوئی نہ کوئی کتاب نہ شائع ہوئی ہو، کچھ عجب نہیں کہ ان کی کتابوں کے صفحات کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جائے۔ چند مشہور کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

سیرت محمد علی، سیرت پاک ﷺ، سیرت ابو حنیفہؒ (ترجمہ)، اسوۂ علیؓ، فاطمہ بنتِ محمد ﷺ، سیرت ائمہ اربعہ، آثار امام ابو یوسفؒ، آثار امام شافعیؒ، سیاست شرعیہ، تاریخ تصوفِ اسلام، اسلام منزل بہ منزل، صحیح مسلم اردو ترجمہ دو جلدوں میں، تلخیص البخاری، زاد المعاد کا چار جلدوں میں اردو ترجمہ، ہارون رشید اوران کا عہد، بہادر شاہ ظفر اوران کا عہد، ٹام راج سے رام راج تک، فتحِ قسطنطنیہ، تاریخ معتزلہ، کاروان اسلام، حیدرآباد جو کبھی تھا، اوراق گم گشتہ، سفرنامہ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ، اقبال اورعشقِ رسول، اقبال اپنے آئینے میں، احمد شاہ ابدالی، عالمگیر، طلسم ہوشربا، گناہ، بالاکوٹ، جدائی، جال، بدنام، ٹھوکر، چنگاری، اسی کا نام دنیا ہے۔ علاوہ ازیں تقریباً ساڑھے تین سو کتابیں آپ نے تصنیف کیں، حیرت ہوتی ہے کہ تنہا ایک شخص نے کتابوں کا اتنا بڑا انبار کس طرح جمع کردیا۔

آخری دوراوروفا :ت

آپ پاکستان میں بے سروسامانی کی حالت میں پہنچے۔ کراچی قیام کیا "خورشید" کے نام سے روزنامہ جاری کیا خواجہ شہاب الدین نے جو اس وقت وزیر داخلہ تھے۔ ایک کمیٹی بنائی جس میں الطاف حسین علی، محمد راشدی اور رئیس احمد جعفری تھے۔ مگر نامساعد حالات اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے خورشید غروب ہوگیا۔ مولانا اختر علی خاں انھیں اپنے ہمراہ لاہور لے آئے۔ ''زمیندار'' کی ادارت سونپی مگر وہ بھی جلد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اور جعفری صاحب نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کردیا اور آخر دم تک اسی سے وابستہ رہے، ہزاروں صفحات لکھے ناشروں کا سلوک وہی رہا جو ہر مصنف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اہل وعیال کراچی کرائے کے مکان میں رہتے رہے۔ خود ایک جگری دوست کے یہاں لاہور میں اقامت پذیر رہے۔ صبح وشام کام میں مصروف رہتے۔ لکھتے، ترجمہ کرتے، اور پھر اپنی گھریلو ضروریات زندگی کے لئے بھی تگ وکرتے، مستقل ذریعہ آمدنی کوئی نہیں تھا۔ ایک دن بھی کام کے بغیر نہیں رہتے، فرماتے " کام نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے "

بڑھاپا پا تیزی سے بڑھتا رہا، آپ دل کے مریض تھے، پہلی مرتبہ جب دل کا دورہ پڑا تو

ڈاکٹروں نے احتیاط اور پرہیز کی تلقین کی ایک حد آپ نے پرہیز کیا لیکن تنصیف و تالیف کی وجہ سے راتوں کو جاگنے کا معمول برقرار رہا بالآخر 22 اکتوبر کو لاہور جنکشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے کہ اچانک پیام اجل آپہونچا اور حرکتِ قلب دم توڑ گئی، نعش ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی لائی گئی جہاں آپ کے سوگواروں میں بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری مرحوم اور دوسرے اعزاء نے باچشم نم اور بادل مصدوم "پی ای سی ایچ ہاؤسنگ سوسائٹی" کے گورستان میں سپرد خاک کیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ.

خاک میں ڈھونڈتے ہیں سونا لوگ
ہم نے سونا سپردِ خاک کیا

ایمان کے بڑے پکے راسخ العقیدہ مسلمان، خوب سیرت، خوبصورت، پروقار دمکتا چہرہ لہجہ نرم و نازک، آنکھوں میں حیاء اور وقار، وضعدار، ملنسار اور شفیق انسان تھے۔ ساری زندگی محنت اور خود اعتمادی سے کام کیا۔ نہ سیاسی خدمات کو اچھالا، نہ علمی و ادبی کاوشوں کا ڈھنڈورا پیٹا اور یہ کتنی بڑی بات ہے کہ تحریک پاک وخلافت کا مایہ ناز مبلغ، تاریخ اسلام کا مصنف، سیرتِ رسول کے مؤلف، اقبال کا شارح، جوہر اور جناح کا سوانح نگار، لاہور کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں پڑا رہا اور آئندہ نسلوں کے لیے تاریخ کے اجڑے تاروں کو سنوارتا رہا، اپنی کلفتوں کو بھول کر اپنی تکلیفوں سے منہ موڑ کر۔

طنز ومزاح

سفر

محمد عمر لکھنوی

سفر۔یعنی اوکھلی میں سر دینا، **السفر قطعة من العذاب.**

وہ الگ بات کہ:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں

اور

واسطہ ہمیں راہ سے ہمراہ سے
رہبر و مرکب سے پڑتا ہے دورانِ سفر

بعض علاقوں میں جانا اس لئے بھی ناگوار ہوتا ہے کہ اُن تک جانے والا راستہ اوبڑ کھابڑ ہوتا ہے یعنی ناہمواری مانع راہروی ہوتی ہے اور کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی، یعنی فطری کسل کہ پڑے رہو گھر میں کیا ادھر ادھر آوارہ گردی کرنا، بیٹھے رہو، طائر خیال کی دُم پہ بیٹھ اڑن چھو ہولو، جہاں جانا ہوا اپنے تصور کے زور پہ گئے اور دم کی دم میں آن رہے، وقت بچا، تکان سے بچے مفت نظارہ ہوا، گویا ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔

آج سفر پہ نکلا اب کیا روئداد سنائیں، گاڑی کی خستگی، راہ کی شکستگی، یا ہمراہیوں کی فربہی کہ سیٹ ہے چار لوگوں کی اور وہ اپنا دوہرا بدن لیکے تین لوگوں کی جائے بیٹھی ہے موٹی عورت، اور کرایہ ایک کا دینا ہے، یہ کیا بے انصافی ہے ایسے لوگوں کا کرایہ بھی دوہرا ہونا چاہیے، اب جب ہم چار لوگ ٹیمپو پہ بیٹھنے چلے تو مرے دو صحت مند دوستوں کو ٹیکسی والے نے آگے بٹھایا مجھ ہاڑ ماس کو دیکھا تو کہا آپ پیچھے کہیں اپنے کو پھنسا لیجے، اب وہاں جگہ ہو تو بیٹھیں بڑی تگ ودو کے بعد دو انچ جا نکلی جا کے اٹک گئی اسی میں راستہ بھر اپنے ہی جی میں کوستے رہے، یہ تو دبلے پتلوں کا حق مارا جاتا ہے کہ چار انگل کی جگہ میں اٹکے وہ بھینس پھیلی پڑی ہے یہ نہیں کہ ذرا سکڑ جائے۔

خیر منزل آئی نازل ہوے بلاٹلی
اب واپسی کی مصیبتیں سنیں
یہ تو پوچھئے گئے کہاں تھے کیوں گئے تھے

گئے تھے کسی کی شادی میں اور جہانگیر آباد گئے تھے سولہ سال پہلے وہاں کی روڈ جیسی تھی الحمدللہ آج بھی ویسی ہے ہاں کچھ گڈھے گہرے ہو گئے ہیں اور ٹیمپو وہی باوا آدم کے زمانے کی یادگار، جسکا ہارن چھوڑ پرزہ پرزہ بجتا ہے، انگ انگ ہلتا ہے، ساری کلیں کمزور ہیں۔

سائلنسر۔ پھٹ پھٹ
کرینک۔ کھٹ کھٹ
ٹپپٹ۔ ٹھک ٹھک
پہیا۔ ڈگ ڈک
باڈی۔ بھڑ بھڑ
چیچس۔ کھڑ کھڑ
انجن۔ جھڑ جھڑ
گیر باکس۔ دھڑ دھڑ
سیٹ۔ ؟ مچڑ

غرض سوطرح کی بے ہنگم آوازیں نکلتی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

ان ٹیمپوؤں پہ بیٹھنا ایک طرح کا دنیاوی عذاب ہے، بروز حشر عجب نہیں جہنمیوں کو میدان حشر سے جہنم تک لے جانے کے لئے اسطرح کی چیزوں کو کام میں لایا جائے۔

خیر دوسری مصیبت یہ کہ جبتک ٹھونس ٹھونس کے اک اک سواری بھر نہ لیں ٹیمپوٹس سے مس نہیں ہو سکتا۔

اب جو لوٹتے میں کسی طرح بارہ بنکی بس اڈے پہنچے تو بس ندارد آخر بے بس ہو کے ٹاٹا میجک پہ بیٹھنا پڑا۔

اب یہاں کی مصیبت دیکھئے۔ ٹاٹا میجک اس طرح وضع کی گئی ہے کہ آگے ڈرائیور کے علاوہ ایک سیٹ اور ہے، بیچ میں آمنے سامنے تین لوگوں کے بیٹھنے کی گدیاں ہے، اور پیچھے دو بالشت کی جگہ سامان رکھنے کی ہے۔

آگے جہاں صرف دولوگوں کی جگہیں ہیں وہاں ڈرائیورسمیت چارلوگ بیٹھتے ہیں بیچ میں چھ لوگوں کی گنجایش ہےتواسمیں آٹھ کو بٹھالا جاتا ہےاور کمینہ پن یہ کہ پیچھےایک پتلی لمبی سی بنچ ڈال دی گئی ہے چارلوگوں کے آٹھ کولہے وہاں بھی آتے ہیں۔

اب ہم لوٹ رہے تھے، بس تو آتی رہی، بہ امر مجبوری میجک پہ بیٹھنے چلے وہاں آگے ایک کی ضرورت تھی اور پیچھے کی بنچ کھالی، ہم چار پہنچے ناچار وہیں بیٹھنا پڑا، بیٹھ تو گئے، ہمیں کونے میں تھے بیچ میں اور دوست، پیچھے کا پلہ بند کرنے چلے تو انکے (دوست کے) گھٹنے آڑے آگئے، لیجئے پلہ کھلا رہ گیا، اب ایک دوست پلہ پکڑے بیٹھا ہے، سب دبے دبے بیٹھے، میرا گھٹنا پلے کی ٹین میں لڑ رہا کولہے کی ہڈی بنچ کی سختی سے پنجہ آزما ہے، میجک بند کھڑی ہے، ایک سواری کے انتظار میں تیرہ لوگ لگے ہیں وقت بیت رہا ہے سواریاں پریشان بیچ میں عورتیں ہیں بار بار چلنے کو کہتی ہیں، ڈراؤر کے کان پہ جوں کیوں رینگے، آخر کار ایک آتا ہے گاڑی چلتی ہے، گاڑی کچھ دور چلی ابھی پکّے پہ چل رہی ہے اچانک سے کچّے پہ آتی ہے اسی پل معلوم ہوتا ہے بدن میں ہڈیاں کہاں کہاں ہے۔

خیر سے گاڑی پکے پہ آگئی لیکن راہ کی ناہمواریاں مسلسل ہڈیوں کو چوٹ پہنچاتی ہیں تا آنکہ گھر پہنچ پیٹھ بستر سے لگا سفر کے نقصان لکھنے لگا۔

قوم کے غیور نو جوانوں کے نام!

رضا خیال دہلوی ❖

غالب اقبال اور فیض کے بعد اردو میں سب سے زیادہ خریدا جانے والا مجموعۂ کلام "پیامِ حاضر" ہے۔ اور یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کم وقت میں پیش روتینوں شعرا سے زیادہ پذیرائی اس مجموعہ کو ملی، منظرِ عام پر آنے سے قبل پری بکنگ شروع ہوئی اور ختم بھی، ادھر منظر عام پر آنے کا اعلان ہوا اور ادھر ایڈیشن ختم۔

اردو شاعری میں یہ مقبولیت کم ہی شعرا کو حاصل ہوتی ہے غالب۔ "وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے" کہتے کہتے ہی دنیا سے پردہ فرما گئے۔ خدا بھلا کرے الطاف حسین حالی کا جنہوں نے دنیا کو غالب سے متعارف کرا کر اردو والوں پر یہ احسان کر دیا کہ وہ بغیر سمجھے بھی دنیا کے سامنے غالب کا نام فخر سے لے سکتے ہیں، مشتاق یوسفی کی غالب کے بارے میں بیان کی گئی صفت دنیائے ادب میں سب سے انوکھی صفت ہے کہ: "غالب دنیا کا وہ واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔

اقبال کو کچھ لوگ شاعر ہی نہیں مانتے؛ مانتے تو عمران پرتاب گڑھی، تہذیب حافی اور علی زریونی کو بھی نہیں ہیں (گستاخی معاف اس جملے سے ہمارا ارادہ تقابل کا ہرگز نہیں) لیکن چونکہ یہ لوگ بقیدِ حیات ہیں، ممکن ہے حادثاتی طور پر اقبال کی مسجدِ قرطبہ جیسی نہ سہی مماثل ہی سہی کوئی نظم ان سے بھی سرزد ہو جائے اور شعرائے اردو میں ان کا شمار ہو۔

مسجدِ قرطبہ پر نظم کا ذکر اتفاقی نہیں اس کے پیچھے اردو کے سب سے بڑے شاعر پر چل رہے کچھ دوستوں کے مباحثے کا ہاتھ ہے، ایک غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر کہنے پر بضد تھے دوسرے اقبال کو بطورِ دلیل انہوں نے اسی نظم کو پیش کیا تو 'غالب کے طرف دار' نے یہ کہتے ہوئے

❖ متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بات رد کر دی کہ: "مسجد قرطبہ پر نظم لکھ دینا پہلے سب سے بڑا شاعر ہونے کی کجا شاعر ہونے کی ہی دلیل بن جائے تو ہم مانیں۔ خیال رہے اس مباحثے میں پیغامات پڑھنے کے علاوہ ہمارا اور کوئی حصہ نہ تھا، ورنہ بحیثیت شاعر ہم جس کسی کو ترجیح دیتے وہ فریقین کے لیے ایسے ہی ناگوار ہوتا جیسے میاں بیوی کے لیے بالترتیب رقیب اور سوکن۔ مگر "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں"۔ بغیر سمجھے غالب کو اتنا بڑا شاعر ثابت کرنے کی ہماری کسی کوشش کا وہی حشر ہوتا جو اقبال کی اندھی پیروی پر کچھ شعراء کا ہوا۔

ہمیں یاد آیا 'دیوان غالب' اور 'پیام حاضر' میں ایک بات مشترک بھی ہے اور وہ یہ کہ غالب نے جب اپنا مجموعہ تیار کیا تو اسے مولانا فضل حق خیر آبادی کو دکھایا اور شاہی صاحب نے بھی اپنا مجموعہ کئی مولویانِ کرام کی نظر سے گزارا تب جا کر مجموعہ اس قابل ہوا کہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔، اس سے اتنا تو سمجھ میں آ گیا کہ آپ اردو میں 'دیوانِ غالب' لکھ دیں یا 'پیامِ حاضر' مولوی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ ہماری نظر میں یہ بھی غالب کے بڑا شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

ابھی کچھ روز قبل ایک دوست پوچھنے لگے کہ آپ اپنا مجموعۂ کلام کب شائع کر رہے ہیں؟ عرض کیا کہ ابھی ہمارا کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے لائق نہیں اور نا ہی ہم اس لائق ہیں کہ شعراء اردو کے دسترخوانوں پر جعلی اصلاح کی ہڈیاں مانگیں۔ یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ پھر اگر ہم اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لگا کر شائع کر بھی دیں تو لوگوں کے دو چار نسخے مروتاً خرید لینے سے ہمارا بھلا ہونے والا نہیں، اور نہ ہم بقول یوسفی حماقت کے اس درجے پر ہیں جہاں مصنف کو کتاب اصلاح معاشرہ کی خاطر کار خیر سمجھ کر لکھنی پڑے۔ جواب آیا کہ "ہر کسی کو 'پیامِ حاضر' کی قسمت کہاں نصیب؛ مجموعے تو جامعہ کے پروفیسرز کے بھی نہیں بکتے!! ہمارے دوست جواب دینے میں ذرا چوک گئے؛ کیوں کہ یہاں بات پروفیسرز کی نہیں شعراء کی ہو رہی تھی، اب بھلا پروفیسر کا شاعری سے کیا تعلق۔ آدمی ایک بار پروفیسر بن جائے تو وہ پروفیسر ہی رہتا ہے چاہے وہ شاعری ہی کیوں نا کرنے لگے (مشتاق صاحب سے معذرت)

مجموعہ ہائے کلام سے اردو کا دامن بہت مالدار ہے اور داغدار بھی۔ اردو میں ہر طرح کے مجموعے دستیاب ہیں، چھوٹے بڑے مجموعے، پتلے اور موٹے مجموعے، نثری اور نظمی مجموعے، غزلیہ مجموعے اور نظمیہ مجموعے اور تو اور نثری نظمی مجموعے، اور ان مجموعہ ہائے رنگا رنگ کے اسمائے گرامی بھی

اتنے ہی اچھوتے ہیں جتنے یہ خود مثلاً: 'مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا' اب شاعر صاحب نام بتا رہے ہیں یا دعا کی درخواست کر رہے ہیں؟ ' کبھی کتابوں میں پھول رکھنا' آپ ایمانداری سے بتائیے کہ اگر کتابوں میں پھول رکھ بھی دیے جائیں؛ تو اس سے شاعر یا قاری کا کیا فائدہ، ہاں! قاری کا پھول خرید کر لانے کا نقصان ضرور ہوسکتا ہے "یعنی، شاید، گمان اور گویا" جب شاعر کو خود ہی اپنے مجموعوں پر یقین نہیں تو قاری پڑھ کر کیا کرے گا۔ ' گردِ مسافت' اگر لکھا ہوا سب گرد ہی ہے تو کیا ضرورت ہے مجموعہ تیار کر کے دوسروں کو گرد آلود کرنے کی۔

قصہ مختصر یہ کہ 'پیامِ حاضر' میں ایسا کچھ نہیں کہ آپ نام پڑھ کر پریشان ہوں، شاعری کی ذمہ داری البتہ ہماری نہیں۔

ہند و بیرونِ ہند، آن لائن، آف لائن ہر طرح کی مارکیٹ میں 'پیامِ حاضر' کا شور ڈیڑھ سال گزر جانے کے بعد آج بھی گونج رہا ہے؛ ورنہ تو ڈیڑھ سال تو کیا ڈیڑھ دن بھی 'مجموعہ ہائے کلام' کا پیر جمانا مشکل ہو جاتا ہے؛ اسی لیے بہت سے مجموعے آج تک منظر عام پر آنے کی جسارت نہ کر سکے، ہمارے ایک دوست ہیں، انہوں نے اپنے ایک عزیز مرحوم کے مجموعے کے باقیات برسوں سے بند پڑے صندوق سے نکال کر منظر عام پر لانے کی کوشش کی اور اس تگ و دو میں عمر عزیز کے کئی سال صرف کر دیے؛ لیکن مجموعہ اب تک منظر عام پر نہیں آسکا، اور آج تک یہ تگ و دو جاری ہے اس میں نا تو ان کا قصور ہے اور نا ہی خود مجموعے کا، قصور صرف اس کساد بازاری کا ہے جو مجموعے کے حوالے سے اردو بازار میں چل رہی ہے۔

"پیام حاضر" کی اس پذیرائی کو دیکھ کر آپ یہ خیال نا کیجیے گا کہ "مجموعہ ہائے کلام" کی دنیا میں یہ ایک تاریخی حادثہ ہے، اگر آپ ایسا تصور کرتے ہیں تو آپ غلط ہیں، اس پذیرائی کو حادثہ یا انہونی اس وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں صاحب مجموعہ کی محنت کے ساتھ ساتھ کتاب کی چند خصوصیات کا بڑا دخل ہے ان میں سے کچھ یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

ایک خاصیت تو یہ ہے کہ اسے کسی بھی اسکول میں دینی تعلیم یا ابتدائی تاریخ کی کتاب کے طور پر شامل نصاب بھی کیا جا سکتا ہے۔ (ممکن ہے عوام نے اس خصوصیت کو منظر عام پر آنے سے پہلے ہی بھانپ لیا ہو)

دوسری خاصیت یہ ہے کہ یہ کتاب قوم کے غیور نوجوانوں کے نام ہے۔ (اب ایسا کیسے ہوسکتا

ہے کہ آپ نوجوانوں کی سوئی ہوئی غیرت کو للکاریں پھر بھی 'شاعری' پڑھ کر غیرت نا جاگے)

اور ایک آخری خصوصیت _ جو بجایے خود انتہائی اہم ہے _ یہ ہے کہ کتاب بہت عمدہ، خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ (آج کل گھروں کی آرائش و زیبائش میں خوبصورت کتابوں کا بڑا دخل ہے اس سے پوڈ کاسٹ یا کسی دوسری ویڈیو کے پس منظر کے لیے ہرے پردے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا ہے)

اب آپ خود ہی تصور کریں کہ آپ کا علمی قد کتنا اونچا ہو جائے گا کہ آپ نے کوئی ویڈیو پوسٹ کی اور پس منظر میں ایک خوبصورت کتاب نظر آ رہی ہے جس پر لکھا ہے: پیامِ حاضر میری قوم کے غیور نوجوانوں کے نام!

تعارف وتبصرہ بر کتب

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر
تاریخ جو کھوگئی از ہیملٹن مارگن

عبداللہ ثاقب

محکوم قوموں کی سب سے بنیادی خرابی عموماً یہ ہوتی ہے کہ وہ حاکم قوموں کے بیانیے سے متاثر ہو جاتی ہیں۔ان کا غلامی اور محکومی کا دورصرف اس لیے دراز ہوتا چلا جاتا ہے کہ وہ خود تک پہونچیں ماضی کی داستانوں میں یہ امتیاز نہیں کرسکتیں کہ کون سا نظریہ اور بات استعمار اور طاقت وروں کا پراپیگنڈا ہے اور کون سی بات حقیقت ہے۔ ماضی کو اپنے دائرے میں رکھ کر اس پر فخر کرنا ہے یا واقعات کی اس کھتونی سے کچھ روشنی مستعار لے کر آگے کے لیے راستے ہموار کرنا ہیں۔ جب تک ان باتوں کو صحیح صحیح اپنے چوکھٹے میں جاگزیں نہیں کیا جاتا کسی بھی محکوم اور ترقی کی دوڑ میں دبی کچلی اور پس قدم قوم کو اس بات پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کو دنیا کے اقتدار میں حصہ ڈالنا ہے۔

اسلام کی روشنی میں تشکیل پانے والی تہذیب نے ایک ہزار سال تک مستقل دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک اپنی ساکھ برقرار رکھی ہے۔اس نے اپنے جلو میں پنپنے والے علوم سے ایسے ایسے لوگوں کو بہرہ اندوز کیا ہے، جن کے علم کے ایک گوشے سے ایک عالم مستفیض ہوا۔سولہویں صدی عیسوی یعنی مسلمانوں کے زوال کی شروعات اور یوروپی تہذیب کے عروج کی شروعات کے بعد یوروپ میں لکھی جانے والی اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کا عمل بھی اسی استعماری پروجیکٹ کا ایک حصہ تھا، جس میں آخر آخر نسل کشی کی شقیں شامل تھیں۔

تاریخ جو کھوگئی (The lost history)، معروف امریکی ناول نگار و سائنس دان ہیملٹن مارگن کی تصنیف ہے۔ جو مغرب میں پروان چڑھنے والے اذہان کے لیے لکھی گئی ہے تا کہ ان کے سامنے "مسلم روشن خیالی (muslim enlightenment) کی صحیح صحیح تصویر کو اجاگر کیا

جا سکے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ کتاب اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے اور نئے اذہان یہ سمجھ سکیں کہ دنیا میں ایک لمبی مدت تک حکومت کرنے والے لوگ جاہل، اجڈ اور بیوقوف نہیں تھے۔ مغرب نے ٹیکنالوجی کے جس پہاڑ کو سر کیا ہے اس کی پگڈنڈی عرصہ پہلے اسی تہذیب کے حاملین نے اپنی جِلت پھرت سے خلق کی تھی۔ یہ کتاب آٹھ ابواب اور ایک خاتمہ کتاب پر منقسم ہے، آلِ روم کی مغلوبیت اور رسول کی پیدائش سے شروع ہو کر یوروپ کے عروج پر یہ داستان ختم ہو جاتی ہے۔

صاحبِ کتاب جگہ جگہ مسلمانوں کی فتح کے مادی اور عسکری اسباب شمار کرواتا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے جن علاقوں کو فتح کیا اور وہاں اپنی سلطنتیں قائم کیں، ہمیشہ وہاں اقلیت میں رہے۔ لیکن اپنی علم دوستی اور رواداری کی بنا پر لوگوں کو اپنا گرویدہ رکھا۔ ایک جگہ مغرب میں لکھی جانے مسلمانوں کی تاریخ اپنا شکوہ کرتے ہوئے لکھتا ہے؛

عرب مسلمانوں کی ابتدائی پیش قدمی پر مغرب میں لکھی گئی تاریخ متعصّبانہ ہے۔ یہ تاریخ کہتی ہے، کہ اسلام کی پہلی صدی محض باہمی لڑائیوں اور ایسی فتوحات پر مبنی ہیں، جن میں مذہب کو مغلوب معاشروں پر جبراً مسلط کیا گیا۔ عربوں کی یہ مہم بڑی حد تک عسکری تھی، جو جنگ کے روایتی طریقوں پر ہی عمل پیرا تھی، معاشروں پر اسلامی فتوحات کے منفی اثرات یکساں طور پر پڑے تھے۔ مغرب کے یہ تاریخی ذرائع وہ زمینی حقائق گم کر گئے تھے، جو دیگر زیادہ اہم واقعات کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہے تھے۔

مسلمانوں پر ایک الزام جو عرصے سے چلا آتا ہے اور بیشتر محققین نے جس کا بھرپور جواب دیا ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں نے لوگوں کو یا تو بالجبر مسلمان کیا یا پھر ایسے ذرائع اختیار کیے کہ لوگ از خود اسلام قبول کرنے لگیں۔ مصنف نے اس پر اپنا فہم پیش کرتے ہوئے لکھا ہے؛

"دوسری بات، مذہب کی جبری تبدیلی کا الزام زمینی حقائق کے منافی ہے۔ مسلمانوں نے جن علاقوں کو فتح کیا، وہاں وہ اقلیت ہی میں رہے۔ مثال کے طور پر فارس میں پہلی صدی ہجری تک مسلمانوں کی آبادی دس فیصد سے بھی کم رہی۔ ابھرتی ہوئی عالمی اسلامی ریاست کا ایجنڈا بنیادی طور پر سیاسی محسوس نہیں ہوتا۔ عرب حکمران اقلیتوں پر مذہبی جبر مسلط نہیں کرتے تھے، یا شاید وہ مفتوحہ کالونیوں پر مذہبی جبر میں کوئی مالی فائدہ نہ دیکھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے ریوینیو کا بڑا حصہ اہل کتاب کے محصولات پر مبنی تھا، جو ظاہر ہے مذہب کی جبری تبدیلی پر منہا ہو جاتا، پھر اس صورت میں نئے

مسلمانوں کے لیے فلاحی خدمات میں اضافہ بھی کرنا پڑتا، یعنی حکومت وقت کو مزید مالی بوجھ برداشت کرنا پڑتا۔ اس لیے اسلام کے ابتدائی دنوں میں یہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ مفتوحین کے لیے مذہبی آزادی بھرپور تھی، اُن پر اسلام کی قبولیت کے لیے کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ وہ معاشرتی سرگرمیوں میں مکمل آزاد تھے، تجارت اور حکومتی کاموں میں بھرپور معاون و مددگار تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر سکتے تھے۔ تاہم توہین اسلام اور توہین رسالت کی واضح ممانعت تھی۔"

اب تو یہ بات بالکل مبرہن اور صاف ہو کر سامنے آ چکی ہے کہ نشأۃ ثانیہ اور بعد یورپ میں باقاعدہ ایسے مصنفین اور نظریہ سازوں کی کھیپ تیار کی گئی جس نے بڑی چالاکی سے یونانی فلسفے اور اسلامی ترقی کی بنیادوں سے مواد اخذ کر کے اس کی نسبت اپنی طرف کی۔ ایک مصری نومسلم فلسفی نے باقاعدہ اس پر ضخیم کتاب لکھی ہے کہ نشأۃ ثانیہ کے وقت کس طرح مادیت کو پروان چڑھانے کے لیے یونانی فلسفے کے ساتھ قطع و برید کی گئی، اور اسلامی مفکرین کا چربہ استعمال کیا گیا۔ اِس کتاب میں بھی مصنف نے ایک جگہ تقریباً وہی بات دہرائی ہے کہ "ایک یوروپ مرکز تاریخ از سر نو لکھی گئی، جس میں مسلمانوں کے سنہرے ادوار کی تہذیبی عظمت حذف کر دی گئی اور نمایاں طور پر جدید ریاضی، علم فلکیات، دوا سازی، سائنس، ٹیکنالوجی ریاست کاری اور کثیر الثقافتی معاشرہ بندی کی بنیاد کا سہرا یورپیوں کے سر باندھ دیا گیا۔"

کتاب کے آخری میں مصنف نے اِس قدیم کثیر الثقافتی اور پرسکون دنیا کے حصول اور بازیابی کے تئیں اپنی سی روشنی ڈالی ہے۔ ہمارا مجموعی تصور تاریخ کس نوعیت کا ہے؟ ہم اس سے کیا اخذ کر سکتے ہیں اور کیا ترک کر سکتے ہیں؟ اس نوعیت کے مزید سوالات اٹھانے کے بعد مزید غور و فکر کی طرف دعوت دی ہے۔ اور جو لوگ مسلم قوم کی بے ترتیبی اور بے تنظیمی کے شاکی ہیں، ان کے لیے یہ کتاب متاعِ بے بہا اور لایقِ مطالعہ ہے۔ اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کرتی ہے کہ وحی اور عقل کا وہ کون سا تعامل تھا جس کے نتیجے میں ہم ایک عالم گیر اور آفاقی تہذیب وجود میں آئی تھی؟ اور وہ کیا عوامل تھے جس کے نتیجے میں دنیا کی ترقی کے کھیل میں پیچھے کر دِیے گئے؟

176 صفحات پر مشتمل یہ اردو میں ناصر فاروق صاحب نے ترجمہ کی ہے۔ کتاب کا اسلوب نہ بہت سلیس ہے نہ بہت رواں۔ علمیت غالب ہے۔ چونکہ موضوع بھی اسی نوعیت کا ہے کہ اس میں جابجا اصطلاحات در آتی ہیں، سو ان کا بس ترجمہ کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ نئے آدمی کے لیے شاید

ان اصطلاحات اوران کے اطلاقات کو سمجھنے میں دشواری ہو، لیکن پیشتر سے ان موضوعات پر نظر رکھنے والا اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ کتاب حرا بک ڈپو لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت اُن کی

فقہ؛ شریعت کی فہمِ سلیم

مرتب: حضرت مولانا مفتی محمد مصعب صاحب علی گڑھی - نائب مفتی دار العلوم/ دیو بند

محمد قاصد میواتی ❖

شریعتِ محمدیہ میں فقہ کا مقام و مرتبہ اور اس کی حیثیت بہت بلند و بالا اور اعلی و ارفع ہے۔ فقہ؛ کتاب وسنت سے ہٹ کر یا شریعت سے الگ ائمہ وفقہاء عظام کی من مانی نئی اختراع و ایجاد نہیں ہے؛ بل کہ کتاب وسنت ہی کی استخراجی صورت اور مذکورہ دونوں مصادرِ شریعت ہی کے معانی کی تشریح وتوضیح کا نام فقہ ہے۔ فقہ کے بغیر دینِ صافی اور شریعت اسلام کی درست تشریح و توضیح تک رسائی ناممکن ہے۔ فقہ کو ہلکا تصور کرنا گویا کتاب وسنت اور پوری شریعت کو ہلکا تصور کرنا اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ہے۔ سرورِ کونین -صلی اللہ علیہ وسلم- کے دور سے لے کر اب تک ہر زمانے میں فقہ کی اہمیت وعظمت مسلم رہی ہے۔ فقہاء کرام نے ہر دور میں پیش آمدہ نت نئے مسائل کو قرآن و حدیث کے معانی وعلل میں غور وفکر کے بعد منقح کر کے امتِ مسلمہ کے سامنے میں پیش کیا ہے۔ اِس عظیم اور اہم فریضے کی انجام دہی میں انہوں نے پوری دیانت وانصاف سے کام لیا ہے۔ اپنی ذمے داری کی ادائیگی اور اس حوالے سے ان کی خدمات وقربانیاں لازوال اور بے مثال ہیں۔ جـزاهـم الله خير الجزاء وشكر الله مساعيهم.

مخالفین ومعاندینِ فقہ درحقیقت مخالفینِ قرآن وحدیث ہیں، فقہ کو معمولی سمجھنا یا قرآن و حدیث سے الگ کوئی چیز سمجھنا اس کی اہمیت کو گھٹانا اور زیغ وضلال میں پڑنا ہے۔ فقہ کی مخالفت سیدھے سیدھے جمہور امت اور شریعت کی مخالفت ہے۔ اکابر واسلاف نے دین مبین کی جو تشریح و توضیح امت کے سامنے پیش کی ہے وہی ترجمانی وتشریح اصل اور درست ترجمانی ہے۔ اکابر واسلاف کے اجتہادات کو غلط سمجھنا یا ان کے اجتہاد کے مقابلے میں اپنی رائے کو اہمیت دینا راہ حق سے انحراف ہے۔

❖ متعلم دار العلوم دیوبند

یہ ایک غلط اور گمراہ کن نظریہ ہے جس کا آغاز انیسویں صدی عیسوی میں ہوا اور اسی کو دلیل بنا کر متجد دین اور گمراہ کُن نظریات کے حاملین لوگوں کو بہکانے میں لگے ہوئے ہیں۔

امت محمدیہ کا آغاز ہی اعتماد سے ہوا ہے اور امت اب تک اس اعتماد کے سائے تلے اپنے اکابر و اسلاف سے مربوط اور وابستہ ہے۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی- رحمۃ اللہ علیہ- فرماتے ہیں:"إن الأمة اجتمعت على أن يعتمدوا على السلف في معرفة الشريعة،فالتابعون اعتمدوا في ذٰلک على الصحابة،وتبع التابعين اعتمدوا على التابعين،وهكذا اعتمد العلماء في كل طبقة على من قبلهم،والعقل يدل على حسن ذلک؛لان الشريعه لا يعرف إلا بالنقل والاستنباط،والنقل لا يستقيم إلا بأن ياخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال'." بے شک امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ وہ شریعت جاننے میں سلف پر اعتماد کرے تابعین نے اس میں صحابہ کرام پر اعتماد کیا، اور تبع تابعین نے تابعین پر، اور اسی طریقے سے ہر طبقہ علماء اپنے پیش رو طبقے پر اعتماد کرتا رہا۔ عقل بھی اس اعتماد کو بنظرِ تحسین دیکھتی ہے؛ کیوں کہ شریعت کی راہ نقل واستنباط کے سوا کچھ نہیں، اور نقل قائم نہیں ہوتی جب تک ہر طبقہ اس میں اپنے سے پہلے طبقے سے متصل نہ ہو۔ (آثارُالتشریع صفحہ ۲۶۶ بحوالہ: عقدالجید۔ص:۲۶۶)

اللہ تعالی نے اپنی قدرت اور حکمتِ بالغہ سے یہ نظام جاری کیا ہوا ہے کہ جب بھی کوئی باطل نظریہ، گمراہ فرقہ پنپتا ہے، اور باطل پرستوں کی جانب سے دینِ اسلام کی غلط ترجمانی اور شریعتِ محمدیہ کی بیخ کنی کی کوشش کی جاتی ہے تو ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ ایسے چنیدہ اور منتخب افراد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جو باطل نظریات کی تردید وتعاقب میں جی جان لگا دیتے ہیں اور امت کے سامنے دینِ اسلام کے صحیح تصویر پیش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ اسی وجہ سے یہ دین اب تک صحیح شکل میں موجود بھی ہے۔ گویا دین کا تحفظ ایسے افراد کے ذریعے تا قیامت ہوتا رہے گا ان شاء اللہ العزیز!

استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی مصعب صاحب علی گڑھی- دامت برکاتہم العالیہ- کی کتاب "فقہ؛ شریعت کی فہمِ سلیم" درحقیقت اسی اہم فریضے کی انجام دہی ہے اس کتاب کے مطالعے کے بعد قاری- بہ شرطیکہ وہ منصف ہو اور تعصب سے پاک ذہن وفہم رکھتا ہو- یہ تصور قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ: یہ کتاب محض ایک رسمی اور وقتی کتاب نہیں؛ جو بس کتب کی فہرست میں محض اضافے کی حیثیت

رکھتی ہو! بل کہ یہ استاذِ محترم کی سالہا سال کی محنتوں کی سعی مشکور ہے۔

امعانِ نظر اور دقت و گہرائی کے ساتھ اس کا مطالعہ پوری زندگی کے لیے مفید اور ممد و معاون ہے۔اس کتاب سے جہاں فقہ کو دین سے الگ سمجھنے والے اور اکابر و اسلاف کے بالمقابل اپنی رائے اور اجتہاد کو بہتر سمجھنے والے متجددین اور گمراہ کن نظریات کے حاملین کی تردید ہوتی ہے وہیں اس کتاب کا اہم اور خاص امتیاز یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے اکابر و اسلاف کی عظمت و عقیدت دل میں پیدا ہوتی ہے۔الغرض اس کا مطالعہ ہر طالب علم خصوصاً طالبِ فقہ کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

ذیل میں ہم کتاب کی □طبِ تالیف، موضوع، امتیازات و خصوصیات پر خود استاذِ محترم کی زبانی اور کتاب میں درج اکابر علماء کی تقریظات اور تائیدات کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کر رہے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

□طبِ تالیف اور اس کا پس منظر:

کتاب کی تالیف کی وجہ اور پسِ منظر بیان کرتے ہوئے خود استاذ محترم رقم طراز ہیں:

"میرے مخدوم و مرشد حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب - دامت برکاتہم العالیہ نے کئی سال پہلے مسجد میں خواتین کی باجماعت نماز میں شرکت کے سلسلے میں مفصل سوال نامے کا جواب تحریر کرنے کا حکم فرمایا تھا۔تقاضا عجلت کا تھا، بندہ نے مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی - قدس سرہ - اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی - رحمۃ اللہ علیہ - کے مشہور رسالے کی روشنی میں جواب مرتب کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔اس کے بعد کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ اس کو باقاعدہ موضوع بنایا جائے۔اس لیے کہ مسجد میں خواتین کی نماز کا مسئلہ ایک قدیم اور مفروغ عنہا مسئلہ ہے، تاریخِ اسلام میں کبھی یہ مسئلہ بحث و نظر کا خاص موضوع نہیں بنا اور فقہاءِ کرام سے جو کچھ جزوی اختلاف منقول ہیں وہ علامہ ابن عبدالبر - رح - کی تصریح کے مطابق حقیقت کے اعتبار سے قریب قریب ہیں۔

لیکن ماضی قریب میں اِس تعلق سے بحث و مناقشہ اور تعاقب و تردید کا جو رخ سامنے آیا، اس سے اندازہ ہوا کہ درحقیقت بات صرف اس مسئلے تک محدود نہیں؛ بل کہ اس طرح کے مسائل کو عنوان بنا کر شعوری یا غیر شعوری طور پر شریعتِ مطہرہ کی مسلسل ایسی ترجمانی کی جا رہی ہے جو ہمارے اسلاف کے متوارث مزاج و منہاج سے مختلف ہے۔اور یہ کوشش نئی نہیں؛ بلکہ انیسویں صدی عیسوی

کے وسط سے متجددین امتِ مسلمہ کے ذہن میں یہ بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس نوعیت کے مسائل میں سلف کے اتباع کے مقابلے میں رائے کی آزادی کی اہمیت کو سمجھا جائے، اور اسلامی احکام کی تشریح تمدنِ جدید کے مطالبات کے تحت کی جائے۔ آج کا نیا دور اسی کا تسلسل ہے، جس کے اثرات مختلف سطح پر محسوس ہو رہے ہیں، خصوصا فقہِ اسلامی کی حقیقت اور اس کی تاریخی حیثیت مبہم اور غیر واضح ہوتی جارہی ہے۔ مروج مضامین میں کہیں برملا اور کہیں تعبیرِ نو کے پسِ پردہ فقہِ اسلامی پر حرف گیری بھی محسوس ہوتی ہے۔

مسجد میں خواتین کی باجماعت نماز کے مسئلے پر براہ راست کلام کرنا کچھ مناسب ومفید معلوم نہیں ہوا؛ اس لیے کہ جب تک نظر وفکر کا رخ اور زاویۂ نگاہ صحیح سمت پر نہ ہو، کوئی مضبوط سے مضبوط دلیل اور بات بھی تشفی بخش اور اطمینان کا ذریعہ نہیں بن سکتی؛ اس لیے بنیادی طور پر پہلے درج ذیل اجزاء پر مفصل کلام کوشش کی گئی ہے:

(۱) دینِ اسلام پر عمل کے معاملے میں امت مسلمہ کے متوارث طرزِ عمل کا خلاصہ۔

(۲) عہد نبوی سے علوم شریعہ کے منتقل ہونے کی مختصر اور جامع تاریخ۔

(۳) فقہ کیا ہے؟

(۴) استنباطِ مجتہدین اور دین کے درمیان فرق وفاصلے کے جدید تصور کا مفصل جائزہ۔

(۵) شرعی احکام کی درجہ بندی کا پس منظر۔

(۶) فروعی اختلافات کی شرعی حیثیت

(۷) دین کی نقلِ صحیح میں محدثین کا کردار۔

(۸) قرآن وسنت کے فہمِ صحیح میں فقہاء کرام کی وجہ امتیاز۔"

(فقہ؛ شریعت کی فہمِ سلیم :ص:۴۲-۴۳)

موضوعِ کتاب

اس کتاب کا موضوع خواتین کی باجماعت نماز کے مسئلے کی آڑ میں متجددین اور گمراہ کن نظریات کے حاملین کی جانب سے پھیلائی جارہی غلط فہمیوں کا اصولی جائزہ پیش کرتے ہوئے امت مسلمہ کے سامنے دینِ اسلام کا صحیح نہج پیش کرنا ہے۔ چناں چہ بنابر تالیف مذکور آٹھ عنوانات پر جامع انداز میں کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

امتیازات وخصوصیات:

(۱) اس کتاب کی اہم خوبی اور خاص امتیاز یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے اکابر واسلاف کی عظمت دل میں پیدا ہوتی ہے، کتاب میں جابجا اکابر کی کتب سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں؛ جن سے پوری بحث قاری کے سامنے منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

(۲) اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اکابر واسلاف کے تذکرے کے وقت ان کا تعارف ایسے القابات سے کرایا گیا ہے؛ جس سے ان کی واقعی خوبی سامنے آجاتی ہے، جسے پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے، اور مصنف کے وسعت مطالعہ اور اکابر واسلاف کی سوانح سے ان کی گہری واقفیت کا علم ہوتا ہے۔

(۳) فقہ کو دین سے الگ سمجھنے والے اور فقہاء کرام کے اجتہادات کے مقابلے میں اپنی رائے کو بہتر سمجھنے والے گمراہ کن نظریہ کے حاملین جامع انداز میں تردید ہو جاتی ہے۔

(۴) یہ کتاب بتاتی ہے کہ فقہ قرآن وحدیث سے الگ کسی چیز کا نام نہیں؛ بل کہ فقہ قرآن وحدیث ہی کی تشریح وتوضیح سے عبارت ہے، اور فقہ شریعت کی فہم سلیم ہے۔

(۵) خواتین کو باجماعت نماز میں مسجد میں ادا کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ آیا وہ منشاء شریعت کے موافق ہے یا خلاف، یہ چیز واضح ہو جاتی ہے۔

(۶) کتاب میں مثبت انداز میں علمی اسلوب میں اصولی بحث کی گئی ہے، جس کا ہضم کر لینا نہ صرف وقتی طور پر مفید ہے؛ بل کہ پوری زندگی کے لیے مفید ومعاون ہے۔

(۷) کتاب میں مصادر کی حیثیت رکھنے والی مستند معیاری اور وقیع کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، کتاب پڑھ کر ان سب سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور استفادہ کی راہیں کھلتی ہیں۔

(۸) کتاب پر اکابر علماء کرام کی تقریظات اور تائیدات درج ہیں؛ جن سے کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

الغرض! یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قیمتی کتاب ہے، ہر طالب علم بالخصوص طالبِ فقہ کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ مطالعہ کے بعد ہی اس کی اہمیت کا احساس ہو سکے گا۔ اخیر میں ہم مذکورہ کتاب کے بارے حضرت الاستاذ حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری –حفظہ اللہ ورعاہ– کے

تأثرات کا آخری اقتباس نقل کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مؤلف موصوف نے اس موضوع پر حضراتِ اکابر علماء دیوبند کے افادات جس جامعیت کے ساتھ پیش کر دیے ہیں، اس انداز سے شاید اب تک یہ کام ہوا نہیں ہوگا، ایک غیر متعصب ذہن اور حق کے متلاشی کے لیے بلا شبہ یہ کتاب بھرپور اطمینان کا باعث ہوگی احقر امید کرتا ہے کہ تمام ہی اہلِ علم اس میں پیش کیے گئے نکات پر غور فرمائیں گے اور اس محفوظ و متوارث منہاج مزاج کو اختیار کریں گے۔"

واللہ ولی التوفیق

شعر وسخن

غزہ کی ایک گڑیا کے نام

اسامہ توحید❖

منظر

اُخی! اُخی! کی صداؤں سے عرش لرزاں ہے
عجیب نغمۂ پر سوز گا رہی ہے بہن
زمین بوس عمارت کے ٹوٹے کمرے میں
بلک بلک کہ کسی کو جگا رہی ہے بہن
وہ سات سالہ بڑا بھائی اس کی دنیا تھا
اب اپنی دنیا سے ملبہ ہٹا رہی ہے بہن
کسی جتن سے تو کھولے وہ سرمئی آنکھیں
اٹھا کے ٹوٹے کھلونے دکھا رہی ہے بہن
وہ بائیں ہاتھ کی کہنی پہ انگلی رکھتے ہوئے
یہاں پہ درد ہے بھائی! بتا رہی ہے بہن

اخی اخی! کی صداؤں سے عرش لرزاں ہے

دھواں چھٹا تو ذرا آسماں دکھائی دیا
شکستہ کمرے میں رستہ بنا رہا ہے کوئی
''ھناک صوتُ صبیہ تعال یا اخوان . . .!
یہ کہہ کے جلدی سے ملبہ ہٹا رہا ہے کوئی

❖ شاعر ونثر ونگار ڈائریکٹر الجامعہ اکیڈمی ہتھورہ

تھکن سے چور تنفس بحال کرتے ہوئے
تجلو! کی صدائیں لگا رہا ہے کوئی
یہ ایسا منظردلدوز ہے خدا کی قسم
کہ اپنے آنسو بمشکل چھپا رہا ہے کوئی
چمٹ گئی ہے بڑے بھائی سے سہم کر وہ
بڑھا کے ہاتھ اب اس کو اٹھا رہا ہے کوئی

اخی اخی کی صداؤں سے عرش لرزاں ہے

قلم میں تاب نہیں ہے کہ اور کھینچوں میں
ہزاروں ایسی تصاویر ہیں فلسطیں کی
ہمارے بیچ اخوت کا ایک بندھن ہے
یہ بات سچ ہے کہ یہ بات ہے شہِ دیں کی
سو اس لحاظ سے ہم بھی تو اس کے بھائی ہیں
یہ اور بات ہے غافل ہیں انتہائی ہیں

اخی اخی کی صدائیں لگا رہی ہے بہن

محبت

ہنر نجمی کا غیر مطبوعہ کلام

محبت ہی وجودِ عالمِ امکاں کی بانی بھی
محبت کا صحیفہ ہر کتابِ آسمانی بھی
محبت حاصلِ کونین بھی ہے جاودانی بھی
محبت انبساطِ روح بھی ہے غیر فانی بھی
محبت طور پر راز و نیاز و مہربانی بھی
محبت رَبِّ اَرِنی بھی محبت لَن ترانی بھی
محبت سے ابھرتے ہیں نقوشِ زندگانی بھی
محبت بخش دیتی ہے حیاتِ جاودانی بھی
محبت کیف و مستی بھی شرابِ ارغوانی بھی
محبت شعر و نغمہ بھی محبت نوجوانی بھی
محبت شہریاری بھی محبت حکمرانی بھی
محبت عین راحت بھی محبت سخت جانی بھی
محبت زیرِ خنجر عدل وحق کی ہے نشانی بھی
محبت کی شہادت حاصلِ صد زندگانی بھی
محبت زندگانی بھی محبت شادمانی بھی
محبت سرد سرد آہیں بھی اشکوں کی روانی بھی
محبت نامرادی بھی محبت کامرانی بھی
محبت آزمائش بھی محبت بدگمانی بھی

محبت ہی جلا کرتی ہے دل کے آ بگینے پر
محبت ہی بدلتی ہے مزاق زندگانی بھی
محبت وہ زباں گویائی جس پر ناز کرتی ہے
تکلم جس کے صدقے اے ہنر وہ بے زبانی بھی

Shu'uur

کامطالعہ کرنے کے لئے کیو آر کوڈ کو اسکین کریں

Anjuman Fikr-o-Tahqeeq Deoband